تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّر قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

تدبر

سلسلہ نمبر ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مئی ۱۹۸۵ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

مولانا عبید اللہ انور کا انتقال ——— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۳) ——— خالد مسعود ۶

حکمتِ قرآن

خدا کی ذات و صفات ——— فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں

——— امین احسن اصلاحی / محبوب سبحانی ۱۲

تزکیۂ نفس

ایمان اور اسلام ——— امین احسن اصلاحی ۴۴

مراسلہ و مذاکرہ

قادیانیوں کی تکفیر کی بنیاد ——— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۵۳

اہلِ ایمان کا ابتلاء کیوں؟ ——— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۵۵

مجلس ترتیب :

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر: ———— ادارہ تدبر قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، رحمن آباد، لاہور-۲۵

مطبع: ———— المطبعۃ العربیۃ - لاہور

قیمت : ۴/= روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

امین احسن اصلاحی

مولانا عبیداللہ انور کا انتقال

اس ملک کے دینی حلقوں کے لیے ایک بڑا سانحہ حال میں مولانا عبیداللہ انور مرحوم کے انتقال کی صورت میں پیش آیا۔ مولانا درس و تعلیم قرآن کے اس قدیم سلسلے کے اس وقت سربراہ تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے لاہور میں جاری تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑا ہی مُبارک اور وسیع سلسلہ تھا۔ اس کی شہرت میں یو۔پی۔ میں بھی سنا کرتا تھا۔ بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں نے اس حلقہ درس سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی خاص خوبی یہ رہی کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبیداللہ انور دونوں نے قرآن کے درس کا کام للہ اور فی اللہ کیا اور بڑے وسیع حلقے میں قرآن مجید کا فیض پہنچایا لیکن اس زمانے میں قرآن کے نام پر جو دکانیں کھلتی اور بلازے قائم ہوتے ہیں، اس طرح کی کوئی چیز انہوں نے قائم نہیں کی۔

اس حلقہ درس سے متعلق میرے لیے خاص دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ہر چند یہ سلسلۂ درس تھا تو اسی معروف طریقے پر جو اس ملک کے پرانے علماء کا طریقہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبیداللہ انور مرحوم دونوں کے قلب میں بڑی وسعت تھی، اعتدال اور میانہ روی تھی، وہ نئے افکار نئے طرز تحقیق اور فکر و تدبر سے متوحش یا الرجک نہیں تھے، بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ رسالہ خدام الدین میں ہمارے رسالہ تدبر پر جب تبصرہ ہوا تو اس کے تحقیقی اور علمی رنگ کو پسند کرتے ہوئے اسے بہر طور لائق مطالعہ قرار دیا گیا اور اہلِ علم کو اس سلسلہ کی سرپرستی کرنے کی سفارش کی گئی۔ قلب کی یہ وسعت و گنجائش خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ چیز اس توسع اور فراخ دلی کے لیے راستہ کھولے گی جو اس دُنیا میں ہم کو بنیانِ مرصوص بنا سکتی ہے۔

میرے خیال میں اس مکتبِ فکر کو یہ روشنی مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم سے ورثے میں ملی ہے۔ شاید آپ لوگوں کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ مولانا سندھیؒ میرے استاد مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ استاد مرحوم ان کا ذکر بڑی محبت سے "ہمارے مولانا عبیداللہؒ" کے الفاظ سے کرتے۔ جب مولانا سندھی عرب میں تھے تو مولانا فراہی ہندوستان سے جانے والے حجاج کے ذریعے ان سے تعلق رکھتے اور جب وہ خود حج کے لیے گئے تو مولانا سندھی سے وہاں ان کی ملاقاتیں رہیں اور واپسی پر انہوں نے مولانا کے بعض نہایت موثر واقعات ہمیں بھی سنائے۔ مولانا سندھیؒ جب کبھی اعظم گڑھ تشریف لاتے تو وہ مولانا فراہیؒ کے مہمان ہوتے۔ اس طرح مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میں ہمیشہ اس مسئلے پر غور کرتا کہ مولانا فراہیؒ اور مولانا سندھی کے سوچنے کے انداز میں بڑا فرق ہے۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے دونوں کو اتنا جگری دوست بنا رکھا ہے۔ واقعات نے مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ مولانا فراہی قدردان تھے مولانا سندھی کے مضبوط کردار، ان کی عزیمت، ان کی استقامت، ان کے استغنا، ان کی شجاعت، فوتت اور خلق سے ان کی بے نیازی کے۔ مولانا سندھی مداح تھے مولانا فراہی کے تفکر و تدبر اور قرآن مجید کے گہرے علم کے۔ اس چیز نے دونوں کی سوچ کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود ان میں گہری محبت پیدا کر دی تھی۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد بھی مولانا عبیداللہ سندھی ایک مرتبہ مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لائے اور مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔ رسالہ الاصلاح کے نکلنے کی تاریخ قریب تھی، یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا سندھی مدرسے میں تشریف فرما ہوں اور رسالے میں ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس زمانے میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی طاقت ان میں ذرا کم ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آپ پر مضمون لکھنا ہے لیکن چھپنے سے پہلے وہ آپ کو دکھاؤں گا نہیں، بڑی محبت کے ساتھ ہنس کر کہنے لگے، اچھا بھائی آپ ایڈیٹر ہیں آپ کو اختیار ہے نہ دکھایئے؛ میں نے وہ مضمون لکھا اور اس میں مولانا کے افکار سے اپنا اختلاف بھی ظاہر کیا۔ اس کا پروف میں نے مولانا کو دکھایا۔ انہوں نے اسے بڑے انہماک سے پڑھا اور واپس کرتے ہوئے کہا، "اچھا بھائی" ٹھیک ہے۔ میرے نزدیک ان کے اندر فکر کی آزادی تھی اور وہ اس کے قدردان تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے افکار کے علمبردار تھے اور یہ بات معلوم

ہے کہ شاہ صاحب کے ہاں بھی فکری آزادی موجود ہے۔ فکر و تدبر کی قدر انہی بزرگوں سے مولانا احمد علیؒ کے خاندان میں بھی ایک اعتدال کے ساتھ منتقل ہوئی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔

مولانا عبیداللہ انور کے انتقال کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انہیں آخرت میں سرخرو اور فائز المرام کرے میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مولانا کے صاحبزادوں، رفقاء اور تلامذہ کو توفیق دے کہ وہ ان کے کام کو مزید سرگرمی کے ساتھ جاری رکھیں اور مولانا احمد علی کے شروع کیے ہوئے مبارک سلسلہ درس کا فیض عام جاری رہے۔

(ترتیب: خالد مسعود)

بقیہ: تفسیر سورۂ آلِ عمران (۳)

نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مرگئے اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔[۹۸]
ان کے لیے عذابِ دردناک ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا[۹۹] ۹۱

---

۹۸ یہ اسلوبِ بیان محض ان کی نجات کے عدم امکان کی تعبیر کے لیے اختیار کیا گیا ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس فدیہ میں دینے کے لیے کچھ ہوگا، نہ آخرت اس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔

۹۹ ان آیات کا مضمون سورہ بقرہ کی آیات ۱۵۹ تا ۱۶۲ میں بھی گزر چکا ہے۔

خالد مسعود

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۳)

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں، حواریوں[۵۲] نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں[۵۳]۝ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ[۵۵]۝ اور انھوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ[۵۶] کیا اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے۝ جب کہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں[۵۷] اور جن لوگوں نے کفر کیا

---

۵۲ حواری کے معنی حامی و مددگار کے ہیں۔ یہ لفظ حضرت عیسیٰؑ کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو آپ پر ایمان لائے اور ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے۔

۵۳ جب بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ کو مایوس کر دیا تو آپ نے اپنے غریب ساتھیوں کو اللہ کے دین کی خدمت و حمایت کے لیے کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے جوشِ فدویت کے ساتھ اپنے ایمان کا اقرار کیا اور اپنے مسلم ہونے پر حضرت مسیحؑ کو گواہ ٹھہرایا۔

۵۵ یہ اس بات کی دعا ہے کہ قیامت کے روز ان کا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا ہو، یہود کی طرح حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔

۵۶ یہ اشارہ ہے یہود کے علماء کی ان کوششوں کی طرف جو انھوں نے حضرت مسیحؑ کو واجب القتل قرار دینے، رومی حکومت کا باغی ظاہر کرنے اور ایک منافق شاگرد یہودا کے ذریعے آنحضرتؑ کو گرفتار کروانے کے لیے کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

۵۷ حفاظت و نصرت کی بشارت کے سیاق و سباق میں قبض کرنے سے مراد موت دینا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی شکل

ہے ان سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمہارا انکار کیا ہے[۵۸]۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۝ تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کو سخت عذاب دوں گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۝ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۝ ۵۷

یہ ہم تمہیں سنا رہے ہیں اپنی آیات اور اپنی پرحکمت یاد دہانی میں سے۝ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا[۵۹]۝ یہی بات تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو[۶۰]۝ سو جو تم سے اس بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمہارے پاس صحیح علم آ چکا ہے تو ان سے کہو کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں، تم اپنی عورتوں کو جمع کرو، ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں، تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں[۶۱]۝ بے شک یہی سچا بیان ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی عزیز اور حکیم ہے۝ پس اگر وہ اعراض کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۝ ۶۳

کہہ دو اے اہلِ کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم

اٹھا لینے کی تھی۔ جب کوئی قوم نبی کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے تو اس وقت نبی بحکمِ الٰہی ہجرت کر جاتا ہے۔ سیدنا مسیحؑ کا یہ رفعِ آسمانی بھی ایک نوعیت کی ہجرت ہی ہے۔

۵۸ تاریخی طور پر یہ بشارت حقیقت ثابت ہو چکی ہے اور نصاریٰ من حیث القوم یہود پر ہمیشہ حاوی و غالب رہے ہیں۔

۵۹ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمۂ 'کُن' سے عیسیٰ کو پیدا کر دیا۔ بلکہ ولادت کے معاملے میں آدمؑ کو اس اعتبار سے عیسیٰؑ پر فضیلت حاصل ہے کہ ان کی ولادت میں نہ باپ کو دخل ہے نہ ماں کو، تو جب نصاریٰ ان کو معبود نہیں مانتے تو آخر حضرت عیسیٰؑ کو کیوں معبود بنا بیٹھے؟

۶۰ اس طرح کے مواقع میں بظاہر خطاب پیغمبر سے لیکن درحقیقت امت سے ہوتا ہے۔

۶۱ جن معاملات میں بنائے اختلاف کوئی عقلی و استدلالی چیز ہو ان میں مسئلے کو طے کرنے کا صحیح طریقہ عقل و استدلال ہی ہے لیکن جہاں استدلال کے تمام مرحلے طے ہو چکے ہوں اور مخاطب محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی بات پر اڑا ہوا ہو تو ایسے موقع پر مباہلہ یعنی جھوٹے فریق پر لعنت کی بددعا کا طریقہ آخری چارۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نصاریٰ نے قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں ٦١ ٦٤

اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو درانحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر اس کے بعد؟ کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے ؟ ٥ تمہیں لوگ ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمہیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہیں ٦٢ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے ٥ ابراہیم نہ تو یہودی تھا نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھا اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھا ٥ ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حق دار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی یہ پیغمبر ہیں اور جو ان پر ایمان لائے ٦٣ اور اللہ اہل ایمان کا ساتھی ہے ٥ ٦٨

اہل کتاب کا ایک گروہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کاش تمہیں گمراہ کر دیں، حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے ہی کو، لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے ٦٥ ٥ اے اہل کتاب اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو درانحالیکہ تم جانتے ہو ٦٦ ٥ ٧١

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں ٥ اور تم اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سوا

---

٦١ توحید اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکساں مشترک دستور ہے۔ اسی کو بحث کی مشترک بنیاد قرار دے کر یہاں اس کے تقاضے اور لوازم واضح فرمائے ہیں اور ان چیزوں کی تردید فرمائی ہے جو توحید کے تقاضوں کے خلاف اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھیں

٦٢ حضرت ابراہیم چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ہی کے مسلم خاندانی و روحانی پیشوا تھے۔ اس وجہ سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین سب اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کا نام استعمال کرتے تھے۔ یہاں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تورات و انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم کے صدیوں بعد ہوا ہے پھر حق کی مخالفت و عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ ان کو تم یہودیت یا نصرانیت پر بھی بھیجے ہو!

٦٣ یعنی ابراہیم سے نسبت خاندان اور نسب سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اتباع و اطاعت سے ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے صحابہ کو حاصل ہے۔

٦٥ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دوسرے کو راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے لیکن اسے اس حرکت کے نتیجہ کا احساس نہیں ہوتا۔

٦٦ یہ اہل کتاب کو ملامت کی ہے کہ اہل کتاب ہو کر تم نے رہنمائی کے بجائے گمراہ کرنے اور اظہار حق کے بجائے کتمان

اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو — ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔ کہ مبادا اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تمہیں ملی ہے یا وہ تم سے تمہارے رب کے حضور حجت کر سکیں ٦٧۔ ان سے کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ٦٨ ٥ ٧٤

اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے ٦٩۔ اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ٥ ہاں جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ٥ ٧٦

جو لوگ ٧٠ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا ٥ ٧٧

حق کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا حالانکہ حق کی تصدیق اور خلق کے آگے اس کی شہادت دینے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے (آل عمران ٨١)

٦٧ یہ اس گہرے بغض و حسد کا پتہ دیتا ہے جو بنی اسرائیل کے اندر بنی اسماعیل کے خلاف تھا جس کے سبب سے وہ کسی طرح بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ بنی اسماعیل بھی ان کی طرح کتاب و شریعت کے حامل بن جائیں اور اللہ کے ہاں ان کے حریف کے گواہ بنیں۔ اس باطنی محرک کے تحت وہ اپنے لوگوں کو یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی غیر اسرائیلی نبی کو تسلیم نہ کریں۔

٦٨ یعنی اپنی سیادت و پیشوائی کو بچانا تمہارے لیے اب ممکن نہیں۔ بنی اسماعیل پر خدا کے انعام کا فیصلہ اب نافذ ہو کر رہے گا۔

٦٩ بنی اسماعیل کے خلاف بغض و حسد کے سبب سے بنی اسرائیل ان کے معاملے میں کسی اخلاقی و شرعی ضابطے کی پابندی کے قائل نہیں تھے۔ یہ مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے ایک پیسے کی امانت میں خیانت کر سکتے ہیں وہ تمہارے نبی کے بارے میں اس حق کی شہادت دیں گے جس کے وہ امین بنائے گئے ہیں۔

٧٠ مراد اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں جو اللہ کے عہد یعنی کتاب و شریعت اور اپنے قول و قرار کو طریدنی اور فروختنی چیز بنائے ہوئے تھے اور اپنے دنیوی مفادات پر ان کو بے دردی سے قربان کر رہے تھے، انہوں نے عہد و پیمان کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے تھے حالانکہ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کلام و خطاب

اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تاکہ تم اس کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں[٤١] اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۞

کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصبِ نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو، بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۞ اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدائے فرماں بردار ہو[٤٢]۞ ۸۰

اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا۔ ہرگاہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی، پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول سچی ثابت کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا[٤٣]۔ پوچھا کیا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور

سے نوازا، ان پر عنایت کی نظر کی اور سیادت و امامت کے تخت پر بٹھایا تھا۔

[٤١] یہ اہلِ کتاب قرأت کی راہ سے لفظ یا جملہ کا تلفظ توڑ مروڑ کر اس طرح بگاڑ دیتے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو جاتی۔ مثلاً انہوں نے مکہ کو بکا، اور مروہ کو مریا، مورہ اور موریا بنا دیا تاکہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بیت اللہ سے کاٹ دیں۔ یہ تصرفات اس غرض کے لیے ہوتے کہ جو چیز اللہ کی کتاب کی نہیں تھی وہ کتاب کی سمجھی جائے۔

[٤٢] یہ نصاریٰ کو دعوت دی ہے کہ وہ عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کریں کہ آج جن باتوں کو وہ مسیحؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ باتیں وہ کتاب، حکمت اور نبوت کا حامل ہوتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بدعات نہ صرف مسیحؑ کی تعلیمات، تمہاری مسلّمہ تاریخ اور انبیاء کے متفق علیہ عقائد کے بالکل خلاف ہیں بلکہ عقلِ سلیم بھی مسیحؑ کی طرف ان کی نسبت قبول نہیں کر سکتی۔

[٤٣] یہ میثاق یہود اور نصاریٰ دونوں سے انبیاء علیہم السلام خصوصاً آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے لیا گیا تھا۔ اس کا حوالہ مائدہ ۱۲ اور اعراف ۱۵۶ - ۱۵۷ میں بھی دیا ہے۔ اس کے کچھ آثار تورات اور انجیل میں بھی موجود ہیں۔ اہلِ کتاب نے من حیث الجماعت اس کا اقرار کیا ہوا تھا لیکن اب وہ اپنے باندھے ہوئے عہد کی ذمہ داریوں سے گریز کر رہے تھے۔

اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی؟ بولے کہ ہم نے اقرار کیا[٤٤]۔ فرمایا کہ تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۞ تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے۞

کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ جو آسمان و زمین میں ہیں طوعاً و کرہاً سب اسی کے فرمانبردار ہیں[٤٥] اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۞ تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں[٤٦]۞ اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۞ اللہ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کرے گا جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا درانحالیکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آ چکی ہیں اور اللہ ظالموں کو بامراد نہیں کرے گا[٤٧]۞ ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوگی۞ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۞ البتہ جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۞ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں۞ بے شک جن لوگوں

---

[٤٤] حضرت موسیٰؑ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات اترتیں تو بنی اسرائیل کی جماعت کو خیمۂ عبادت میں جمع کرتے اور حکم سنانے کے بعد اس کی اطاعت کا اقرار لیتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ہر امر و نہی اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد و میثاق کا درجہ حاصل کر لیتا۔

[٤٥] یہ باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ اگر اہلِ کتاب اپنے عہد کی ذمہ داریوں سے گریز کر رہے ہیں تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں۔ اللہ کا دین تو اسلام ہے جو تمام کائنات کا دین ہے اس لیے کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنے دائرۂ تکوینی میں طوعاً و کرہاً بہرحال اللہ ہی کی اطاعت کرتی ہے۔

[٤٦] یہ امتِ مسلمہ کے کلمۂ جامعہ کا حوالہ دیا ہے جو اہلِ کتاب کی طرح تعصبات میں گرفتار نہیں (بقرہ ۱۳۶)۔

[٤٧] سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں اپنے نشاناتِ راہ گم کریں اور اپنے آپ کو خود ٹھوکر کھلائیں۔ اہلِ کتاب کے دل مانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں لیکن ان کی زبانیں دل کی اس گواہی کو جھٹلاتی ہیں۔ لہٰذا ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور ساری خلقت کی لعنت ہو۔

(باقی صفحہ پر)

حکمتِ قرآن
امین احسن اصلاحی

خدا کی ذات و صفات
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں

اصحابِ فکر و فلسفہ کے سامنے خدا کی ذات اور صفات کے متعلق ابتدا ہی سے چند بنیادی سوال رہے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور خلق کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؛ یعنی یہ کہ کیا خدا خلق کو پیدا کرنے کے بعد بالکل بے تعلق زنکار ہو کر بیٹھ گیا ہے یا اس نے خلق کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا ہے۔ اگر اس نے اپنا تعلق قائم رکھا ہے تو وہ کس نوعیت کا ہے اور خلق کے ساتھ اس کے رابطہ کا ذریعہ کیا ہے؟

دوسرا اہم سوال یہ پیشِ نظر رہا ہے کہ کیا انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، یعنی کیا خدا انسانی عقل کی رسائی سے اتنا بالاتر ہے کہ انسان اس کی کوئی معرفت حاصل نہیں کر سکتا یا خدا انسان کی عقل کی گرفت میں آسکتا ہے؟

تیسرا سوال ان کے سامنے یہ رہا ہے کہ انسانوں کی طرح خدا بھی ایک مشخص (PERSON) ذات ہے جس کی خصوصیات اور صفات معلوم ہیں یا خدا ان قوتوں، طاقتوں اور قوانین کا نام ہے جو اس کائنات میں بالکل اس طرح جاری و ساری ہیں جس طرح انجن میں حباب ہوتی ہے یا جسم کے اندر روح ہوتی ہے، یعنی خدا بھی ایک توانائی ہے جس نے کائنات کو متحرک کر رکھا ہے۔

سوالات تو اور بھی ہیں لیکن یہی بنیادی اور اہم سوالات ہیں۔ ان کے علاوہ ان فلسفیوں کی رائے جنھوں نے تہذیب اور مذہب کے ارتقا پر گفتگو کی ہے، غور طلب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان ابتدا میں خدائے واحد سے نہیں بلکہ بہت سے خداؤں اور دیوتاؤں سے آشنا ہوا۔ عقل کی ترقی کے ساتھ غیر ضروری خدا چھٹتے چلے گئے یہاں تک کہ ایک خدا باقی رہ گیا۔ دوسرے الفاظ میں دین کا آغاز شرک سے ہوا اور پھر رفتہ رفتہ انسان توحید کی لذت سے آشنا ہوا۔

اہلِ فلسفہ کی آراء

یونان کے ابتدائی فلسفیوں کی رائے:

یونان کے ابتدائی دور کے فلسفیوں نے جب خدا کی ذات و صفات پر غور کرنا شروع کیا تو انہوں نے دیوتاؤں کے متعلق عام لوگوں کے عقیدہ سے تعرض نہیں کیا لیکن کائنات کے وجود میں آنے کی توجیہ مختلف طریقوں سے کرنے کی کوشش کی۔ تھیلیز (THALES) (۶۲۴ —— ۵۵۴ ق م) نے کہا کہ دنیا کو کسی خدا نے پیدا نہیں کیا بلکہ جس طرح دوسری چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اسی دنیا بھی وجود میں آگئی۔ اینکسی مانڈر (ANAXIMANDER) (۶۱۰ —— ۵۴۶ ق م) نے کہا کہ ہر چیز لامحدود سے پیدا ہوئی ہے، ان کو کسی دیوی یا دیوتا نے پیدا نہیں کیا۔

ہیراقلیطس (HERACLITUS) (۵۳۵ —— ۴۷۵ ق م) دیویوں اور دیوتاؤں کا سخت مخالف ہے۔ ان کا ذکر نہایت حقارت سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عام لوگ جن بتوں کی پرستش کرتے ہیں ان کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے فلسفی شاعر زینوفینز (XENOPHANES) نے دیوتاؤں پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ خدا ایک ہی ہے جس کو فنا نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ لوگوں نے اپنی شکلوں پر دیوتاؤں کو بنایا ہے۔ اگر بیلوں، خنزیروں اور دوسرے جانوروں کے ہاتھ میں بھی موئے قلم ہوتا تو وہ اپنی صورت پر خدا کو بنا ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ حبشہ کے دیوتاؤں کا رنگ کالا اور ناک چپٹی ہے۔ زینوفینز کا کہنا ہے کہ خدا ہر لحاظ سے انسانوں سے مختلف ہے۔ خدا ایک وحدت ہے جس کی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ وہ ایک ہی جگہ پر رہتا ہے، وہاں سے حرکت نہیں کرتا۔ اس کو دنیا کا نظام چلانے کے لیے کوئی کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ خدا کائنات کا اساسی کلیہ ہے۔ خدا ہی کائنات ہے۔

سوفسطائی فلسفیوں نے بہت سے خداؤں کے تصور پر بڑے تند و تیز حملے کئے۔ انہوں نے کہا کہ دیوتاؤں کا تصور قرینِ عقل نہیں کیونکہ ان کے وجود کی کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ ان فلسفیوں نے نوجوانوں کو جمع کر کے توحید کی اشاعت کی۔ بتوں پر ان کی جرح کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے فلسفیوں نے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا کہ خدا کا صحیح تصور کیا ہے۔

سقراط:

یونان کے عظیم فلسفی سقراط (SOCRATES) (۴۷۰ —— ۳۹۹ ق م) نے خدا کی وحدانیت کا

تصور دیا اور بتوں کے خلاف انتہائی جارحانہ اور مدلل تنقید کی۔ اس کی جرح نے بت پرستی تو کیا اوہام پرستی کی بھی جڑ اکھاڑ دی جس کو یونان کی حکومت برداشت نہیں کر سکی اور جیوری نے اس پر الزام لگایا کہ وہ بتوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کر کے نوجوانوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس جرم میں اس کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو توحید ہی کی خاطر زہر کا پیالہ پینا پڑا اور اب مورخین کو بھی اس کی شہادت مل گئی ہے۔

افلاطون :

افلاطون (PLATO) (۴۲۸ ق م ——— ۳۴۸/۳۴۷ ق م) نے دیوتاؤں کے متعلق عام تصور سے تعرض نہیں کیا۔ اس کی تحریروں میں تضاد ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کا ذہن یکسو نہیں۔ وہ بتوں کا نام بھی لیتا ہے اور خدائے واحد کا بھی قائل ہے البتہ جب وہ توحید کا بیان کرتا ہے تو دلائل کے ساتھ کرتا ہے اور بتوں کا ذکر کرتا ہے تو روایت کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ اپنے استاد کی طرح زہر کا پیالہ پینے کا حوصلہ نہیں رکھتا یا وہ عوام کو چھیڑے بغیر اپنے طبقے کو توحید کی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور انسان میں اپنی روح پھونکی۔ انسان کا جسم روح کا قید خانہ ہے، اس لئے ہمیں جلد سے جلد زمین سے چھٹکارا حاصل کر کے آسمانوں کی طرف پرواز کر جانا چاہیئے کیونکہ روح کا اصل ٹھکانہ آسمان ہے۔

ارسطو :

ارسطو (ARIS TOTLE) (۳۸۴ ق م ——— ۳۲۲ ق م) خدا کی وحدانیت پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ وہ انسان کی عقل کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور یزدانی (DIVINE SPARK) اور عقل ملکوتی (DIVINE REASON) ہے۔ خدا کائنات کا خالق ہے، وہی محرک اول بھی ہے اور کائنات کو چلانے والا بھی۔ خدائے واحد نے انسان کے اندر سب کچھ ودیعت کر دیا ہے۔ اگر وہ اس کو پہچان لے اور اس کی تربیت اور نشوونما کرے تو درجۂ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے نبوت کی جو ضرورت ہے، ارسطو نے اس کو انسان کے اندر مان لیا ہے۔
ارسطو کا خیال ہے کہ ہر چیز کا محور خدا ہے اور مادہ کی قید سے آزادی حاصل کرلینا ہر چیز کی انتہا ہے۔

ابیقوری :

ابیقوری (EPICUREANS) (۳۴۱ ——— ۲۷۰ ق م) مفکرین ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے۔

ان کا خیال ہے کہ خدا بہت سے ہیں۔ وہ شکل وصورت میں انسانوں کی طرح ہیں البتہ ان سے بہت زیادہ خوب صورت ہیں۔ ان میں مرد اور عورت کی طرح جنس کی تفریق بھی ہے۔ وہ کھاتے پیتے ہیں اور یونانی زبان بولتے ہیں۔ ان دیوتاؤں نے نہ دنیا بنائی اور نہ ہی دنیا کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں۔ وہ خوش وخرم رہتے ہیں اور انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔

رواقی :

رواقی (STOICS) فلسفی خدا کی وحدانیت کے شدت سے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا نے ہر چیز پیدا کی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ وہ انسانوں سے محبت کرتا ہے برائی پر سزا اور نیکی پر جزا دیتا ہے۔ خدا کا دنیا سے وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے ہے۔ جس طرح بیج سے بے شمار پھول پیدا ہوتے ہیں اسی طرح روح سے ہر قسم کی زندگی نمو پاتی ہے۔ ان کے نزدیک خدا کے اندر پوری کائنات ہے اور کائنات کی ہر چیز میں خدا ہے۔ گویا خدا کے متعلق رواقیوں کا فلسفہ وحدت الوجود کے تصور پر مبنی ہے۔

فیلو :

اس کے بعد جو دور آیا اس میں مذہب کو فلسفہ میں شریک کر دیا گیا اور فلسفہ نے علم کلام کی شکل اختیار کرلی۔ اس دور کے ایک قابل ذکر فلسفی فیلو (PHILO) (۳۰ ق م ——— ۵۰ء) نے توحید کا وہی تصور دیا جو توریت میں ہے لیکن یہ تصور بھی اس نے بہت ہلکا دیا۔ فیلو کے نزدیک خدا اپنی عظمت، قدرت، رحمت اور کمال کے لحاظ سے انسان سے اتنا عظیم اور بلند ہے کہ انسان نہیں جان سکتا کہ وہ کیا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ خدا موجود ہے۔ خدا علت العلل (CAUSE OF CAUSES) ہے۔ جس طرح شمع پورے ماحول کو روشن کرتی ہے اسی طرح خدا کے نور سے پوری کائنات منور ہے۔

پلوٹینس :

پلوٹینس (PLOTINUS) (۲۰۴ء ——— ۲۶۹ء) پلوٹینس اور فیلو کے خدا کے تصور میں معمولی سا فرق ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی ہر چیز کی علت خدا ہے لیکن خدا کمال کے اس درجہ تک پہنچا ہوا ہے کہ ہم یقین سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے

کہ وہ کیا ہے۔ ہم اس کے متعلق جو کچھ بتاتے ہیں وہ اس کی ذات کا نہایت حقیر سا تصور ہے۔ پلوٹینس کا کہنا ہے کہ خدا ایک چشمہ کی مانند ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ دنیا کو خدا کی ضرورت ہے لیکن خدا دنیا سے بے نیاز ہے۔

سینٹ آگسٹائن :

عیسائی متکلمین نے عیسائیت اور یونانی فکر میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ کائنات میں نظم اور قرینہ خدا کے وجود یا محرکِ اول ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ خدا ازلی اور ابدی ہے وہ سراسر خیر و برکت اور دانش مجسم ہے۔ یہی دانش وہ قوت قاہرہ ہے جو ہر چیز کو کنٹرول کر رہی ہے۔ عیسائی متکلمین کا سب سے بڑا نمائندہ سینٹ آگسٹائن (SAINT AUGUSTINE) (۳۵۴ء —— ۴۳۰ء) ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا ازلی ہے۔ وہ دنیا کو عدم سے وجود میں لایا۔ ہر چیز کو پیدا کرنے سے قبل خدا نے اس کی تقدیر بھی طے کر دی۔ اس لیے خدا کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ اس کی مخلوق دنیا میں کیا کچھ کرے گی۔ اس کے نزدیک انسان کے اندر نیکی اور خیر کا جو تصور ہے خدا اس کی کامل ترین شکل ہے۔ وہ خالقِ کل، قادرِ مطلق علیم و خبیر اور سراسر خیر و برکت ہے۔

سینٹ آگسٹائن نے خدا کا جو تصور دیا ایک عرصہ تک وہی تصور قائم رہا لیکن بعض لوگوں نے اس سے معمولی اختلاف بھی کیا۔ مثلاً آئرلینڈ کے جان ارجینا (JOHN ERIGENA) (۸۱۰ء —— ۸۷۷ء) نے کہا کہ ہم کائنات پر غور و فکر کے ذریعہ جو کچھ جان سکتے ہیں وہ بہت ہی معمولی اور حقیر ہے۔ حقیقت میں خدا کو جاننا ممکن نہیں کیونکہ اس کے نزدیک جو سمجھ میں آگیا وہ خدا کیونکر ہوا۔ پہلی صدی عیسوی میں پال کی عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا جس نے تثلیث کا فلسفہ گھڑا۔ اس نے کہا کہ آدم کا جو گناہ انسان کے ساتھ چپک گیا ہے اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو دنیا میں بھیجا۔ مزید برآں کائنات کا نظام چلانے کے لیے خدا نے اس کے اندر ایک ملکوتی قوت جاری و ساری کر دی جس کو اس نے روح القدس کا نام دیا۔ اس طرح باپ، بیٹے اور روح القدس کے فلسفہ نے جنم لیا۔ عیسائی متکلمین نے کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے اور اس ایک میں تینوں شامل ہیں۔ چونکہ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی تھی اس لیے اس کو منوانے کے لیے کلیسا کی طرف سے جبر کیا گیا جس کی وجہ سے مذہب بدنام ہوگیا اور یہ تصور عام ہوگیا کہ مذہب کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں اور پھر مذہب کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی۔

جس وقت عیسائی متکلمین عیسائیت کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان

ہی دنوں ایک تحریک ابھری جس نے کہا کہ خدا کو عقل کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا اس کے لیے مشاہدۂ ذات ہی واحد راستہ ہے۔ اس کو بعد میں تصوف کا نام دیا گیا۔ ان صوفیوں نے کہا کہ مشاہدۂ ذات سے ہمیں جو معرفت حاصل ہوتی ہے وہ عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ تصوف کے ذریعہ انسان کی روح جسم کے قید خانہ سے نکل کر آسمانوں میں پہنچ جاتی ہے جہاں وہ خدا کی ذات میں ضم ہو جاتی ہے اس طرح روح اپنے اصل گھر میں واپس پہنچ جاتی ہے۔

تھامس ایکوائناس :

تھامس ایکوائناس (THOMAS AQUINAS) (۱۲۲۶ء —— ۱۲۷۴ء) پر ارسطو کے فلسفہ اور منطق کا گہرا اثر تھا اس لیے اس نے عیسائیت اور ارسطو کے فلسفہ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ خدا روح یا قوت ہے جس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے دنیا بنائی۔ خدا قادرِ مطلق ہے اور دنیا پر اسی کی بادشاہی قائم ہے۔

مائیسٹر ایکھارٹ :

مائیسٹر ایکھارٹ (MEISTER ECKHART) (۱۲۶۰ء —— ۱۳۲۷ء) نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ سب چیز خدا کے اندر ہے اور ہر چیز کے اندر خدا ہے۔ میں جب اپنے آپ سے بات کرتا ہوں۔ تو خدا سے بات کرتا ہوں۔ جب مجھے مشاہدۂ ذات ہو جائے گا تو میں خدا میں ضم ہو جاؤں گا۔

فرانسس بیکن :

کلیسا کے جبر کا جب زور ٹوٹنا شروع ہوا اور نشاۃ ثانیہ کے آثار پیدا ہوئے تو دنیا میں پھر سے عقل کی روشنی پھیلی۔ فلسفیوں نے خدا کی ذات و صفات کو سمجھنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفیوں نے جس خدا کا تصور دیا وہ کلیسا کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) (۱۵۶۱ء —— ۱۶۲۶ء) نے کلیسا کے خدا کو ترک کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس نے فلسفیوں کے خدا اور کلیسا کے خدا میں مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ الٰہیات کی دو قسمیں ہیں ایک فکری اور دوسری الہامی۔ آفاق اور انفس پر غور و فکر کے بعد خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی ہے وہ فکری الٰہیات ہے اور مذہب خدا کے متعلق جو کچھ بتاتا ہے وہ الہامی الٰہیات ہے۔ بیکن نے کہا کہ ہم عقل کے ذریعہ

خدا کو ماننے پر مجبور ہیں لیکن ہم اس سے زیادہ خدا کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ اگر جاننا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں کلیسا سے رابطہ رکھنا پڑے گا۔ یعنی کلیسا کی فقہ، اس کے علم کلام اور روایات کو ماننا پڑے گا۔ اس نے یہ مشورہ دیا کہ عقل کی چھوٹی سی کشتی کو چھوڑ کر کلیسا کے جہاز پر سوار ہو جاؤ۔ درحقیقت یہ بیکن ہے جس نے مذہب اور دنیا کے امور میں تفریق کے حق میں فلسفہ بنایا اور مذہب کو ایک بے عقل کی چیز قرار دیا۔

تھامس ہابس :

تھامس ہابس (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ء ——— ۱۶۷۹ء) نے بیکن کی مصالحانہ روش کو پسند نہیں کیا اور وہ عقل کی کشتی کو چھوڑ کر کلیسا کے جہاز پر سوار ہونے پر بھی آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ عقل خدا کو مانتی ہے اس لیے میں بھی خدا کو مانتا ہوں۔ اس نے کہا کہ خدا ایک مجسم ذات ہے جس نے دنیا بنائی اور ہر چیز کو حرکت دی۔ وہ انسانوں کے ذریعہ دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ ہم اس سے زیادہ خدا کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے اس لیے ہمیں اسی پر قانع رہنا چاہیے۔

ڈیکارٹ :

ڈیکارٹ (DESCARTE) (۱۵۹۶ء ——— ۱۶۵۰ء) یہ نہیں مانتا کہ عقل صرف اتنا ہی جان سکتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی بہت سی صفات اور ان کے تقاضوں کو بھی جانا جا سکتا ہے۔ خدا ازلی ہے وہ قادر مطلق، علیم و خبیر اور سراسر خیر و برکت ہے۔ اس نے انسان کے اندر جو تصورات ودیعت کیے ہیں وہ فراڈ نہیں بلکہ حقائق ہیں ان کو ماننا واجب ہے اور زندگی کے معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ انسان کی فطرت کے اندر جو اصول و کلیات ودیعت ہیں ڈیکارٹ ان سب کو مانتا ہے۔ کائنات کے مشاہدہ اور تاریخ کے مطالعہ سے جو اصول اخذ ہوتے ہیں ڈیکارٹ ان کو بھی مانتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ انسان کی راہنمائی کے لیے کافی ہیں اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے گویا وہ ان اصولوں کو شریعت کا درجہ دیتا ہے۔

سپینوزا :

سپینوزا (SPINOZA) (۱۶۳۲ء ——— ۱۶۷۷ء) صوفی ہے۔ اس کے نزدیک ہر جگہ اللہ ہی اللہ ہے۔ وہ کائنات کو ایک مجموعی مشین مانتا ہے یہ مشین جن فطری قوانین پر چل رہی ہے ان کا نام خدا ہے۔

خدا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے سب اس کے اندر یعنی یہ سب خدا ہے۔ جب ہم خدا سے محبت کرتے ہیں تو اپنے سے محبت کرتے ہیں اور جب ہم اپنے سے محبت کرتے ہیں تو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم خدا ہیں۔ اس کے نزدیک عقل اور جسم خدا کی شانیں ہیں۔ دونوں میں خدا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح سپینوزا نے وحدت الوجود کا فلسفہ پیش کیا جس کا اثر بعد کے فلسفیوں نے بھی قبول کیا۔ اگر کوئی خدا کو مجسم ذات نہ ماننا چاہے اور بحیثیت روح، قوت محرکہ یا قوانین فطرت کی شکل میں ماننا چاہے تو سپینوزا نے اس کی بنیاد فراہم کر دی۔

جان لاک :

جان لاک (JOHN LOCKE) (۱۶۳۲ء ——— ۱۷۰۴ء) کا کہنا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے۔ انسان اپنی خلقت پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ آپ سے آپ وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کا کوئی خالق ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا روح ہے، خدا علیم و خبیر، قادر مطلق اور عادل ہے۔ اس نے دنیا بنائی، انسان کو پیدا کیا، کائنات میں اپنے قوانین جاری و ساری کیے، یہ قوانین آفاق و انفس پر غور کرنے کے بعد معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ ان قوانین کی پابندی کرنے والے جزا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

جارج برکلے :

مشہور عیسائی پادری برکلے (GEORGE BERKELY) (۱۶۸۵ء ——— ۱۷۵۳ء) نے کہا کہ خدا ہی دنیا کا خالق ہے۔ وہ لطیف ترین روح ہے اور پوری کائنات میں یہ روح سرایت کیے ہوئے ہے۔ مادہ یا جسم اسی روح کی ایک شان ہے۔

ڈیوڈ ہیوم :

ہیوم (DAVID HUME) (۱۷۱۱ء ——— ۱۷۷۶ء) ارتیابی فلسفی ہے۔ وہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر چیز دھوکا دیتی ہے، آنکھ بھی دھوکا دیتی ہے۔ اس لیے انسان کسی چیز کا تعین نہیں کر سکتا لہٰذا انسانی عقل بھی خدا کو نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن خدا کو ماننا ضروری ہے کیونکہ یہی چیز انسان کی تمام امیدوں کا مرکز اور اخلاقیات اور معاشرہ کی اساس ہے۔ دوسرے الفاظ میں گو عقل کے ذریعہ خدا کو پہچانا نہیں جا سکتا لیکن اس کی ضرورت بہرحال موجود ہے۔ انسان اپنے معاشرتی نظام اور اخلاقی نظام کو قائم رکھنے اور اپنے دل کو ڈانواڈول ہونے سے بچانے کے لیے خدا کو ماننے

پر مجبور ہے۔

لائبنز :

لائبنز (LEIBNITZ ۱۶۴۶ء — ۱۷۱۶ء) کے نزدیک خدا اعلیٰ اور اکمل ذات ہے اور انسان ادنیٰ اور نامکمل ہے اس لیے انسان خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا البتہ اس کا ہلکا سا تصور کر سکتا ہے کیونکہ نیکی، طاقت، علم اور خدا کی بعض دوسری صفات کا ہلکا سا پرتو اس کے اندر موجود ہے۔ ان صفات کو اگر مبالغہ کی انتہائی حد تک بڑھا دیا جائے تو ہم خدا کی کچھ معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے دنیا کو بہترین شکل میں پیدا کیا اور خدا دنیا کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔

عمانویل کانٹ :

جرمنی کا عظیم فلسفی کانٹ (IMMANUEL KANT ۱۷۲۴ء — ۱۸۰۴ء) ان فلسفیوں کا سخت مخالف ہے جو کہتے ہیں کہ عقل اور تجربہ سے باہر کسی چیز کو ماننا ٹھیک نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ پوری کائنات کا ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن ہم اس کو مانتے ہیں۔ اس لیے اگر خدا عقل و تجربہ میں نہیں آتا تو اس کے معنی یہ نہیں کہ خدا موجود نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا ہماری فطری اور اخلاقی ضرورت ہے اس کے ماننے پر ہماری کامل مسرت اور طمانیت کا انحصار ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی کے لیے خدا کی سخت ضرورت ہے کیونکہ عقل کا مطالبہ ہے کہ اچھے لوگ خوش رہیں لیکن دنیا میں اچھے لوگ پریشان رہتے ہیں اور برے لوگ مزے کرتے ہیں۔ اس لیے ایک ایسی ذات ہونی چاہیے جو سراسر خیر و برکت، مجسم دانش اور قادر مطلق ہو تاکہ وہ نیکی اور مسرت کو یکجا کر سکے۔

جان فختے :

فختے (JOHANNE GOTLLIEB FICHTE ۱۷۶۲ء — ۱۸۱۴ء) کانٹ سے اس بات میں متفق ہے کہ خدا ہماری اخلاقی ضرورت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا کائنات کا خالق ہے۔ لیکن اس کا خالق کوئی نہیں۔ خدا انسان کے ضمیر کے اندر موجود ہے۔

جوزف شیلنگ :

جوزف شیلنگ (GOSEPH SCHELLING ۱۷۷۵ء — ۱۸۵۴ء) نے کہا کہ خدا تخلیقی

قوت ہے جو کائنات کے اندر جاری و ساری ہے۔ دنیا اسی لیے حرکت پذیر ہے کہ وہ خدا ہے۔ گویا یہ فلسفی وحدت الوجود کا قائل ہے۔

فریڈرک ہیگل :

ہیگل (FRIEDRICHE HEGEL ۱۷۷۰ء — ۱۸۳۱ء) کا خدا اس کے نظریہ ارتقاء کا حصہ ہے۔ اس کے نزدیک دنیا ترقی کر رہی ہے اس لیے خدا بھی ترقی پذیر ہے۔ دنیا کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا شعور بھی ترقی کر رہا ہے۔ انسان میں یہ شعور کمال کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ ہیگل کا کہنا ہے کہ خدا تخلیقی دانش کا نام ہے جس کا اظہار دنیا میں ہو رہا ہے۔

گستاف فشنر :

فشنر (GUSTAV FECHNER) کے نزدیک خدا اعلیٰ ترین روح ہے جو دنیا میں اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح جسم کے اندر روح ہے۔

آگسٹ کومٹ :

بعد کے فلسفیوں نے خدا کو سمجھنے کی کوششیں ترک کر دیں اور اس معاملہ کو مذہب کے حوالہ کر دیا۔ آگسٹ کومٹ (AUGUSTE COMTE ۱۷۹۸ء — ۱۸۵۷ء) کا کہنا ہے کہ اسباب و علل کو تلاش کرنا ناپختہ انسانی ذہن کی علامت ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن جب پختہ ہو جاتا ہے تو وہ خدا کو تلاش کرنے کی کوششیں ترک کر دیتا اور اشیاء اور واقعات میں تعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سر ولیم ہملٹن :

سر ولیم (SIR WILLIAM HAMILTON ۱۷۸۸ء — ۱۸۵۶ء) کا کہنا ہے کہ جس کا جی چاہے خدا پر یقین کرے لیکن خدا کے متعلق کچھ جاننا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ انسان کی عقل صرف محدود چیزوں کو جان سکتی ہے اور لامحدود چیزیں اس کی رسائی سے باہر ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر :

اسپنسر (HERBERT SPENCER ۱۸۲۰ء — ۱۹۰۳ء) بھی اسی خیال کا حامی ہے کہ

ہم صرف وہی چیز جان سکتے ہیں جو متعین اور محدود ہو۔ چونکہ خدا لامحدود ہے اس لیے ہم خدا کو نہیں جان سکتے لیکن خدا موجود ہے۔ وہ کیا ہے یہ ہم نہیں بتا سکتے۔

بریڈلے :

بریڈلے (F. H. BRADLEY) (۱۸۴۶ء——۱۹۲۴ء) نے اسپنسر سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ لامحدود کو بھی جانا جا سکتا ہے کیونکہ لامحدود کائنات میں ہم آہنگی کا نام ہے جو دنیا کی ہر چیز میں موجود ہے جس کو انسان اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے۔

ولیم جیمز :

ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) (۱۸۴۲ء——۱۹۱۰ء) کا کہنا ہے کہ ہم خدا کے وجود اور اس کے متعلق کسی چیز کو بھی ثابت نہیں کر سکتے" لیکن خدا کو ماننے پر مجبور ہیں کیونکہ ہماری فطرت کا تقاضا یہی ہے اور ہمارا دل بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ جیمز کے نزدیک انسان ایسے خدا کو ماننا چاہتا ہے جو اس کی زندگی سے بے تعلق یا نرنکار نہ ہو بلکہ اس کا اس کی زندگی سے گہرا تعلق ہو۔ وہ انسان کا رفیق، مونس و غم خوار ہو۔ جیمز کے خیال میں خدا انسان سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے لیکن انسان سے بہت زیادہ طاقت ور ہے۔

جان ڈیوی :

ڈیوی (JOHN DEWEY) (۱۸۵۹ء——۱۹۵۲ء) کا کہنا ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسی دنیا میں پاتا ہے جس میں اس کو شر بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ اس نے شر سے محفوظ رہنے کے لیے کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے انسان نے مختلف نظریات گھڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے متعلق مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔

اہلِ فلسفہ کی آراء پر تنقید

خدا کی ذات و صفات کے متعلق فلسفیوں اور مفکروں نے جن آراء کا اظہار کیا ہے ان پر تنقید سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فلسفیوں کی اس رائے پر بحث کریں کہ مذہب کا آغاز شرک سے ہوا ہے۔

مذہب کا آغاز ایک خدا کے تصور سے ہوا :

بعض فلسفیوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں انسان سب سے پہلے ایک خدا سے آشنا نہیں ہوا بلکہ شروع میں بہت سے خداؤں کو مانا جاتا تھا جن میں سے ایک بڑا خدا تھا لیکن عقل کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر ضروری خدا چھٹتے چلے گئے تا آنکہ ایک خدا باقی رہ گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان نے جب اپنے آپ کو اس دنیا میں پایا تو خوفناک حوادث سے اس کو سابقہ پیش آیا جو طوفانوں، زلزلوں، سیلابوں، وباؤں اور دوسری شکلوں میں پیش آتے رہتے ہیں ان سے وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس خوف کے جذبے نے انسان کو اُن ان دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔ عقل اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان حوادث، طوفانوں، زلزلوں، سیلابوں اور وباؤں کی توجیہ ہوتی چلی گئی تو ان کے خداؤں سے بھی انسان کو چھٹکارا حاصل ہوتا چلا گیا۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز اَن دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اوّلین اور قدیم ترین ہے بالکل بے سروپا ہے۔ انسانوں میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ مثلاً انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں اس سے چھن نہ جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ہوا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔

اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں وہ دنیا کے عام واقعات میں سے نہیں۔ زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، وبائیں روز نہیں پھوٹتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں۔ اس کے برعکس تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، چاند روپہلی چاندنی کی چادر روز دشت و جبل میں بچھاتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، ابرِ کرم کی تردستیاں اور درختوں کی ثمرباریاں ہر موسم میں موجود ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہرِ قدرت کی گاہ گاہ کی گھڑکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعمِ غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔ اس لیے انسان کے مشاہدۂ کائنات

اور مشاہدۂ انفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہوا۔ گویا دین کا آغاز توحید سے ہوا، اس میں کجی پیدا کر کے شرک کی راہ انسان نے بعد میں اختیار کی۔

تاریخ بھی اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ دنیا پہلے دیوتاؤں سے آشنا ہوئی اور پھر بتدریج ایک خدا تک پہنچی۔ یونان کے اصنام پرستی کی تاریخ، ہندو دیومالا کی داستان اور چین کی بت پرستی کی کہانی سب اس بیان میں مشترک ہیں کہ کچھ دیوتا ہیں، ان کی بیویاں ہیں، ان کے اندر رقابتیں ہیں، ان میں ہولناک جنگیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ اس آسمانی کنبہ کا سربراہ زیوس (ZEUS) ہے اس کی بیوی ہیرا (HERA) ہے۔ اس کے علاوہ اپالو (APOLLO) ہرمیس (HERMES) اور ایفروڈائٹی (APHRODITE) بھی ہے باقی سارا کنبہ اسی سے پیدا ہوا۔ یونانی ان کے شر سے خوف زدہ رہتے تھے اور ان کو راضی رکھنے کے لیے ان کی پرستش کرتے اور قربانیاں دیتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ آسمانی کنبہ کہاں سے آیا اور انسانوں کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ مظاہر فطرت تھے جن سے انسان کو نفع یا نقصان پہنچتا تھا اس لیے انسانوں نے ان کو خوش کرنے کے لیے پوجا پاٹ کا نظام گھڑ لیا۔ اصنام پرستوں کی بیان کردہ یہ تاریخ بالکل ادھوری اور نامکمل ہے اس میں اس حقیقت سے صرفِ نظر کیا گیا ہے کہ شروع ہی سے ایک خدا کی دعوت دینے والے بھی دنیا میں موجود رہے ہیں۔ یونانی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہیراقلیطس (HERACLITUS) اور زینوفینز (XENOPHANES) ایسے فلسفی بھی موجود تھے جنہوں نے بتوں اور دیوتاؤں کا بری طرح مذاق اڑایا۔ ان کے فلسفہ کا حوالہ ہم اوپر کی سطور میں دے چکے ہیں۔

اس ابتدائی دور کے بعد سوفسطائیوں (SOPHISTS) کا ایک پورا گروہ موجود ہے جنہوں نے نوجوانوں کو جمع کر کے توحید کی تبلیغ اور اشاعت کی۔ اس مقصد کے لیے ایک جماعت بنائی جو بتوں پر بہت ہی تیز و تند جرح کرتی اور ان کی سخت تحقیر کرتی۔

یہ سقراط کے پہلے کا یونان ہے جو عام طور پر تاریک دور کہلاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی نہ صرف توحید کی دعوت دینے والے لوگ موجود تھے بلکہ ایسی جماعتیں بھی موجود تھیں جو شرک کا مذاق اڑاتیں اور لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلاتیں۔

اس کے بعد سقراط، افلاطون اور ارسطو کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ سقراط توحید پرست ہے۔ تاریخی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سقراط کو زہر کا پیالہ توحید ہی کی خاطر پینا پڑا۔ سقراط نے جو جرحیں کی ہیں وہ بت پرستی تو کیا اوہام پرستی کی بھی جڑ اکھاڑ دیتی ہیں۔ اسی طرح افلاطون نے بھی توحید کی دعوت دی ہے۔ اس نے

اگرچہ بتوں کو نہیں چھیڑا لیکن برملا کہا کہ خدائے واحد ہی نے تمام دنیا کو پیدا کیا اور انسانوں میں اپنی روح پھونکی ارسطو پکا موحد ہے۔ اس نے بتوں کے معاملہ میں کوئی مصلحت روا نہیں رکھی، وہ انسان کے اندر روح ملکوتی اور شعلہ یزدانی تک کا قائل ہے۔ اس لیے جب ابتدائی دور ہی میں ایسے فلسفی گزرے ہوں تو یہ دعویٰ کس طریقے سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دنیا سب سے پہلے بتوں اور دیوتاؤں سے آشنا ہوئی۔

قرآن مجید نے انسانوں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس کے مطابق آدمؑ پہلے انسان اور خدا کے نبی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی ذرّیت کو شرک نہیں سکھایا، توحید ہی سکھائی۔ قرآن مجید نے ان کے بیٹوں کے جو واقعات بیان کیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف توحید سے بلکہ قانون اور عدل و انصاف سے بھی واقف تھے اور خدائے واحد کی رضا جوئی کے لیے قربانیاں پیش کرتے تھے۔

اولادِ آدم میں آہستہ آہستہ توحید سے بُعد پیدا ہوا اور شرک کے طور طریقے ان میں گھر کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ انہوں نے قوم کو پھر سے توحید کی راہ پر لانے کی کوشش کی لیکن ان کی دعوت پر لبیک کہنے والے کم ہی نکلے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قوم پر طوفان کا عذاب بھیجا اور موحدین سے نئی دنیا آباد کی۔

اس کے بعد قرآن مجید نے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ انہوں نے توحید کے لیے کیا کیا قربانیاں دیں، چاند اور سورج کو پوجنے والوں کو کیسے مسکت جواب دیے اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کا کیسا کیسا مذاق اڑایا جس کے نتیجہ میں ان کے لیے آگ کی چتا تک تیار کر دی گئی جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ توحید کی خاطر انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور ہجرت کر کے فلسطین کے علاقے میں آئے۔ انہوں نے توحید کا مشن جاری رکھنے کے لیے کئی مراکز قائم کیے اور مکہ میں بیت اللہ تعمیر کیا انہوں نے خدا کی رضا کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیلؑ کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی انہی قربانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسماعیل اور بنی اسحاق میں کثرت سے ان کے پیروکار ہوئے۔ ابتداءً ان کی ذرّیت توحید پر کاربند رہی لیکن آہستہ آہستہ اس میں شرک نے راہ پائی۔ سب سے آخر میں حضرت محمدؐ رسول اللہ تشریف لائے جنہوں نے شرک کی جڑیں کاٹ دیں اور دنیا کو پھر سے توحید کی لذت سے آشنا کیا اور ایک نئی اُمّت برپا کی۔ اس امت نے اس کے باوجود کہ آنحضرتؐ کا لایا ہوا صحیفہ اس کے ہاتھوں میں ہے، شرک میں جو دلچسپی لی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

قوموں سے خطاب کے دوران رسولوں کی زبان سے یہ جملہ قرآن مجید نے نقل کیا ہے کہ:

'لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' (زمین کی اصلاح کیے جانے کے بعد پھر اس میں فساد نہ پھیلاؤ) اس سے بھی معلوم ہوا کہ دین کا آغاز صحیح نہج پر ہوا اور فساد بعد میں پھیلا۔ پس حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں توحید اور شرک کی کشمکش برابر چلتی رہی ہے بلکہ ہوا یوں کہ توحید سے آغاز ہوا، بعد میں لوگ توحید سے جاہل اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ مزید برآں چونکہ توحید انسان کی اصل فطرت ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اصل فطرت مجہول رہے اور شرک اصل بن جائے۔ چونکہ شرک کا محرک خواہشات ہیں جن کی پیروی کر کے انسان کو نقد نقد نفع مل جاتا ہے۔ اسی لیے دنیا میں شرک کا غلبہ ہو جاتا ہے لیکن کوئی دور ایسا نہیں رہا ہے جو توحید کی دعوت اور توحید کے علمبرداروں سے خالی رہا ہو۔

خدا محض ایک قوتِ محرکہ نہیں :

بعض فلسفیوں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ خدا شخص ذات نہیں بلکہ وہ قوتِ محرکہ (MOTIVE FORCE) یا علت العلل (CAUSE OF CAUSES) ہے بنیادی طور پر یہ خیال فلسفیوں کا نہیں بلکہ سائنسدانوں کا ہے اسی لیے میرے نزدیک ان کی رائے منطقی نہیں ہے، ان کا ذہن مشینی ہوتا ہے، یہ لوگ جذبات سے بھی عاری ہوتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ عقل کے دائرے میں ان کا قبلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے یعنی مادی وجود، اس کے باہر وہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے، فلسفے میں اگر اس تصور کی کوئی بنیاد ہے تو وہ اسپنوزا کے فلسفے میں ہے جس کا کہنا ہے کہ خدا قانون قدرت، ایک بہت بڑی مشین یا قوت محرکہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کو قوت محرکہ یا علت العلل مان لینے سے انسان کا کون سا مسئلہ حل ہو جاتا ہے یا اس کی کونسی ضرورت پوری ہو جاتی ہے؟ انسان کو ایسے خدا کی ضرورت ہے جو اس کی نیاز مندیوں اس کی دعاؤں، اس کی محبت اور اس کی التجاؤں کا مرکز و محور ہو، وہ جب چاہے اس کو پکار سکے، اس کے آگے فریاد کر سکے، جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو وہ اس کی فریاد سن سکے۔ اس کو یہ توقع ہو کہ میں جہاں سے بھی پکاروں وہ سنتا ہے وہ جو بھی کرنا چاہے گا، کرے گا، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ سب ہماری فطرت میں ہے اس لیے ہم ایسی صفات والے خدا کے محتاج ہیں۔ مجرد ایک طاقت محرکہ یا مجرد قوانین قدرت سے ہمیں کیا حاصل ہوگا۔ ان کے آگے ڈنڈوت کر کے ہمیں کیا ملے گا، ہم ایک مشین کے آگے گڑگڑا کر کیا کریں گے۔ خدا اگر انجن کے اندر بھاپ کی طرح ہے تو اس کے آگے فریاد کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اپنا کام

کرے گا یا ہماری فریاد سنے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا کو قوت محرکہ یا قوانین فطرت مان لینے سے اس کائنات کی توجیہ بھی نہیں ہوتی۔ آپ ایک کار کو دیکھیں اور یہ دعویٰ کریں کہ میں اس کے راز کو پا گیا ہوں کہ یہ پٹرول سے چلتی ہے تو یہ دعویٰ کار کی اصل حقیقت کا عشر عشیر بھی نہیں، سوال صرف اس کے چلنے کا نہیں۔ کار کے اندر عظیم سائنس ہے، اس کے اندر حسن و جمال ہے، اس کی افادیت ہے، اس کی پیچیدہ مشینری ہے، اس کے اندر ہزاروں پرزے ہیں جو کار کو چلاتے میں اپنا اپنا کام کرتے ہیں ان تمام چیزوں کی توجیہ یہ مان لینے سے تو نہیں ہو سکتی کہ کار پٹرول سے چلتی ہے، پٹرول تو محض کار کی حرکت کا باعث ہوتا ہے، یہ ایک اندھی بہری قوت مہیا کر دیتا ہے جس کو کنٹرول کر کے مفید مصرف میں لانے کے لیے بھی کار کے انجن کی ساخت کو دخل ہے۔ پس حرکت کی علت جان لینے سے اگر ایک کار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تو پھر اس پورے نظام عالم کی توجیہ محض ایک قوت محرکہ کے تصور سے آپ کیسے کر سکتے ہیں!

اس کائنات میں ربوبیت کا جو عظیم نظام ہے، جو عظیم قدرت، عظیم حکمت اور عظیم صناعی نظر آتی ہے، قدم قدم پر رحمانیت یا رحیمیت کے جو مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں، کیا ان سب کی توجیہ ایک قوت محرکہ کے تصور سے ہو سکتی ہے؟ ذرا غور کیجیے کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن انسانوں کی پرورش کے سامان کی فراہمی میں سرگرم ہیں، چاند بھی اسی لیے مصروف کار ہے، ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔ پرورش اور تربیت کا یہ تمام اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک گوشہ ہی میں نہیں پایا جا رہا ہے بلکہ ہر گوشہ میں موجود ہے، ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیر تربیت ہے، ہمارا جسم بھی پل رہا ہے، ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں، ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے، پھر یہ دیکھیے کہ ہمارے لیے زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا شامیانہ تنا ہوا ہے، سورج اور چاند چمک رہے ہیں، ابر و ہوا ہماری خدمت میں سرگرم ہیں۔ کیا ان سب کی توجیہ یہ کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ اس کے پیچھے کوئی قوت محرکہ یا علت العلل ہے۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی رحیم و کریم، علیم و خبیر، سمیع و بصیر، حکیم و مدبر ذات ہے جس نے یہ سارا اہتمام کیا ہے۔ اگر اس قوت محرکہ کے اندر ہی یہ تمام اعلیٰ صفات موجود ہیں تو پھر اسے محض ایک قوت کا نام کیوں دیا جائے، کیوں نہ اسے اللہ کہا جائے جو بہت عمدہ نام ہے اور کائنات کی توجیہ کے لیے نہایت موزوں ہے۔

جہاں تک اہلِ فلسفہ کا تعلق ہے ان کی عظیم اکثریت شروع سے آخر تک یہ مانتی چلی آئی ہے کہ خدا ہے۔ تمام بڑے فلاسفر یہی رائے رکھتے ہیں اور اسی پر فلسفہ زندگی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہیوم جیسا ارتیابی فلاسفر بھی خدا کی ضرورت کا قائل ہے اور اسی تصور پر زندگی کے نظم و ضبط کو منحصر مانتا ہے۔ صرف وہ فلاسفر خدا کے قائل نہیں جنہوں نے بحیثیت مجموعی زندگی کا فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ محض کسی ضمنی چیز کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ ان کے نزدیک پوری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ مثلاً بعض لوگ نظریہ ارتقا کو خدا کا بدل سمجھتے ہیں۔ فرائڈ نے فرج کو اور مارکس نے بطن کو اپنے فلسفہ کا محور بنا لیا۔ میرے نزدیک یہ لوگ اصل فلسفی نہیں۔ تمام اصل فلسفی خدا کو مانتے ہیں اور اس طرح مانتے ہیں جس سے انسانی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بعض منکرین کے اس خیال کا تعلق ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقا نے خدا کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں ارتقا ہوا ہے۔ زندگی۔ پانی، گندے کیچڑ، خشک مٹی اور کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی موجودہ حالت کو پہنچی ہے۔ ایک مٹی کے لوندے سے اتنی شکلیں بن گئیں۔ زندگی جو کبھی رینگنے والے جانوروں کی شکلوں میں چھپی ہوئی تھی اس سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے انسان کی احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈارون نے اور زیادہ سنجیدگی سے خدا کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کائنات کو اتنا بے رنگ نہ سمجھو۔ یہ ایک عظیم مدبر کی قدرت کا کرشمہ ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی سے گوناں گوں اشکال اور ایک عاقل و فرزانہ انسان بھی پیدا کر دے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارتقاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ ارتقا ہوتا ہی رہتا، آخر ارتقا ایک حد پر آ کر کیوں رک گیا ہے ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے کہ ایک مدبر ذات نے اس کو ایک حد پر روک دیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مرد اور عورت کا بھی ارتقا ہوا لیکن ان دونوں میں اتنی سازگاری کس طرح پیدا ہوئی کہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل ہے اور دونوں مل کر کائنات کے ایک عظیم مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک حکیم، قدیر اور مدبر ذات ہی ہو سکتی ہے جس نے یہ سب کچھ کیا۔ یہ تمام کرشمے کسی اندھی بہری قوت محرکہ کے نہیں ہو سکتے۔

خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے:

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، یا خدا انسانی عقل کی رسائی سے بالاتر ہے تو اس معاملہ میں بیشتر فلسفیوں کی یہ رائے ہے کہ خدا موجود ہے یا

خدا کی ضرورت موجود ہے یا انسان خدا کو ماننے پر مجبور ہے لیکن خدا کی صفات اور اس کی معرفت حاصل کرنا انسانی عقل کے بس میں نہیں۔ مثلاً فرانسس بیکن نے کہا کہ ہم عقل کے ذریعہ خدا کو ماننے پر مجبور ہیں لیکن اس سے زیادہ ہم خدا کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ تھامس ہابس، ڈیوڈ ہیوم اور دوسرے فلسفیوں نے بھی یہی کہا ہے کہ ہم عقل کے ذریعے صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ خدا ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتے، البتہ ڈیکارٹ نے کہا ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی بہت سی صفات اور ان کے تقاضوں کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

عقل کی نارسائی کا یہ نوحہ بے بنیاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو انسان کی عقل کا یہ حال ہے کہ اگر ہڑپہ، موہنجو داڑو اور دوسرے آثارِ قدیمہ سے کوئی ٹوٹا ہوا مرتبان مل جائے تو اس کے اوپر آڑھی ترچھی لکیروں کے ذریعہ وقت کی تہذیب، وقت کا فلسفہ، وقت کا کلچر اور ثقافت سب کچھ معلوم کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے کہیں سے کوئی ہڈی یا جبڑا دریافت ہو جائے تو قدیم انسان کی ساخت، اس کی بود و باش اور اس کی عمر سب کچھ معلوم کر لی جاتی ہے لیکن دوسری طرف ان کی عقل کی نارسائی کا یہ عالم ہے کہ یہ پورا صحیفۂ کائنات ان کے سامنے ہے، آسمان ہے، زمین ہے، سمندر ہیں، پہاڑ ہیں، ستارے ہیں، سورج ہے، چاند ہے، کہکشاں ہے، قوموں کے عزل و نصب کے لیے خدا کے قوانین ہیں لیکن اس سے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر صرف گرد و پیش کی اشیاء پر غور کرے تو خدا کی صفات اور ان کے تقاضوں کو جان سکتا ہے۔ انسان کو اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنے چاروں طرف انواع و اقسام کی اجناس، غلے، سبزیاں، ترکاریاں، گوشت، پھل، میوے اور مشروبات نظر آتے ہیں تو کیا یہ خدا کی پروردگاری، اس کی ربوبیت اور اس کی رحمت کو ظاہر نہیں کرتے؟ سورج اور اس کی گرمی اور روشنی سے کیا خدا کی قدرت اور حکمت ظاہر نہیں ہوتی؟ بے ستون آسمان اور اس پر جگ مگ کرتے تارے خدا کی عظیم صناعی اور اس کے حسن و جمال کو ظاہر نہیں کرتے۔ رحم کی تاریکیوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا موئے قلم جس طرح بچہ کی نوک پلک سنوارتا ہے کیا اس سے اس کی تخلیق کی صفت ظاہر نہیں ہوتی؟ خدا کی صفات کا علم حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان صحیفۂ کائنات کو کھلی آنکھوں کے ساتھ پڑھے اور اس کے تقاضوں کو سمجھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خدا کو سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے اور نہ سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے۔ نہ سمجھنے کا دائرہ جو ہے اس میں ہمیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ خدا کس چیز کا بنا ہوا ہے، اس کی ذات کیسی ہے، اس کی شکل کیسی ہے، وہ کس نوعیت سے اٹھتا ہے اور

بیٹھتا ہے، کس طریقہ سے بات کرتا ہے، اس طرح کے سوالات انسان کی ذہنی استعداد سے باہر کے دائرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر یہ ساری باتیں ہم جان بھی لیں تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

ہمیں جاننے کی ضرورت ہے تو اس بات کی کہ خدا کی مرضی کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں اس کی پسند و ناپسند کیا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے ہم کس طرح دنیا میں رہیں، ہمارا سیاسی نظام کیا ہو، ہماری معاشرتی زندگی کیسی ہو، حلال و حرام کے جاننے کیا ہوں، ہماری معیشت کیسی ہو۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیں خدائی پسند و ناپسند اور اس کے احکام جاننے کی ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں پر ہماری زندگی کا انحصار ہے اور اس کا انتظام بھی اللہ تعالےٰ نے بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ اس کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا۔ کیونکہ خدا نے جب انسان کی جسمانی اور مادی ضرورت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انسان کی ہدایت کا انتظام نہ کرتا۔

خدا کی ذات کے متعلق ہم اس لیے بھی کچھ نہیں جان سکتے کہ اس کے متعلق ہمارے اپنے پاس کچھ نہیں ہے، صفات کے متعلق ہمارے پاس کچھ تو ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ مثلاً خدا علیم ہے تو کچھ علم ہمیں بھی دیا ہے، خدا خبیر ہے تو کچھ خبر ہمیں بھی دی ہے، خدا قوی ہے تو کچھ قدرت ہم میں بھی ہے، خدا سمیع ہے تو کچھ سامعہ ہم میں بھی ہے۔ اس لیے علم کا، قدرت کا، رحم کا اور دوسری چیزوں کا ہم تصور کر سکتے ہیں، لیکن خدا کی ذات کا کوئی حصہ ہم میں نہیں ہے، لہٰذا ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

قرآن مجید کی تعلیم

وجودِ باری کی بحث غیر ضروری ہے:

قرآن مجید کو غور سے پڑھیں تو حیرت انگیز طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متکلمین اور فلسفیوں کے طریقہ کے خلاف وہ وجودِ باری کے مسئلہ پر کوئی بحث نہیں کرتا۔ متکلمین اثباتِ باری تعالیٰ پر سارا زور دیتے ہیں اور خدا کے وجود کے دلائل بیان کرتے ہیں لیکن یہ مسئلہ قرآن مجید میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے کچھ وجوہ ہیں۔

قرآن کے اوّلین مخاطب خدا کے منکر نہ تھے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے اولین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسمٰعیل تھے جو

نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا اقرار بھی کرتے تھے۔ ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بناء پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا۔ بنی اسرائیل تھے جو خدا اور اس کی تمام صفاتِ حسنیٰ کے قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک۔ قریش نے ۳۶۰ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ نصاریٰ تین خداؤں کو مانتے تھے چنانچہ قرآن مجید نے ان گروہوں سے ان کو منکرِ خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلّمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انہوں نے ان مسلّمات سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کا شریک ماننے والے سے خدا کے وجود پر بحث کرنا بے سود ہے کیونکہ خدا کو تو وہ مانتا ہی ہے۔ اس سے تو یہ مطالبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک خدا کو ہم بھی مانتے ہیں اور ایک خدا کو تم بھی مانتے ہو، یہ بات ہمارے درمیان مشترک ہے لیکن ایک خدا کے سوا باقی جن خداؤں کو تم مانتے ہو ان کے ثبوت فراہم کرو، ان کی دلیل بتاؤ۔ اسی لیے قرآن مجید نے مشرکین کو بار بار چیلنج کیا ہے کہ تم جن خداؤں کو مانتے ہو اس کی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے اگر ہے تو پیش کر کے دکھاؤ:

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ	اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو بھی پکارے گا جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا۔
(مومنون - ۱۱۷)	

سورہ یوسف میں فرمایا:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ	تم نہیں پوجتے اس کے سوا مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔
(یوسف - ۳۰)	

سورہ الاحقاف میں فرمایا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ	کہو ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کیا چیز ہے زمین کی جو انہوں نے بنائی ہے یا کیا چیز ہے جس میں آسمانوں میں ان کا ساجھا ہے، میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب

أَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝	لاؤ یا کوئی اور علمی سند اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

(الاحقاف - ۴)

چونکہ شرک کی کوئی دلیل نہیں اس لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ صرف خدائے واحد کی عبادت کی جائے جس کو سب مانتے ہیں، اور اس کے منافی ہر بات ترک کی جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اہل کتاب کے لیے یوں پیغام دیا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى	کہو اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے
كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا	اور تمہارے درمیان مسلم ہے کہ نہ بندگی کریں ہم
نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	اللہ کی اور نہ ساجھی ٹھہرائیں اس کا کسی چیز کو اور نہ
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	بنائیں ایک دوسرے کو اس کے سوا رب۔ پس
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا	اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ ہم تو اللہ
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝	کے فرمانبردار ہیں۔

(آل عمران - ۶۴)

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بعض علمی حلقوں کی طرف سے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب میں دہریے بھی تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ آیت وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ - ۲۴) (ہم کو تو بس گردش روزگار فنا کرتی ہے) پیش کرتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عرب میں دہریوں کی کوئی جماعت موجود نہیں تھی۔ عرب جو یہ بات کہتے تھے تو اس سے ان کا مقصود خدا کی ہستی کا انکار نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ بات وہ قرآن کے اس دعوے کے جواب میں کہتے تھے کہ قوم کے عروج وزوال کا انحصار اس کے عقائد واعمال کے صلاح وفساد پر ہے۔ عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور قوم فرعون کے متعلق قرآن بتاتا تھا کہ ان کی تباہی کا سبب ان کا کفر وشرک، ظلم وسرکشی، فسق وعدوان اور ان کے دوسرے عملی واعتقادی فسادات تھا اور اس بنیاد پر وہ عربوں کو متنبہ کرتا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی اعتقادی اور اخلاقی غلطیوں کی اصلاح نہ کی تو اپنی قوت وجمعیت کے باوجود وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات عربوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ قوموں کے عروج وزوال میں کسی اخلاقی اصول کو کارفرما نہیں مانتے تھے۔ وہ قوم کو ایک درخت کی طرح سمجھتے تھے جو اگتا ہے، نشوونما پاتا ہے، پھل پھول لاتا ہے، یہاں تک کہ اپنی فطری قوتیں نچوڑ کر ایک دن گردش لیل ونہا کی نذر ہو جاتا ہے یا ایک فرد کی مانند سمجھتے تھے جو پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر کسی بیماری کے سبب سے یا درازی عمر سے ایک دن مرجاتا ہے۔ موت وزیست کا جو طبیعیاتی ضابطہ کائنات کے ہر گوشہ میں کام کرتا

ہے (۲) اسی ضابطہ کو قوموں کی موت وزیست میں بھی کارفرما مانتے تھے۔ قرآن مجید نے تاریخ کو ایک نئے نقطہ نظر سے پیش کیا جو ان کے مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے بہت مختلف تھا اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان سے ایک ایسی زندگی کا مطالبہ کرتا تھا جو ان کی خواہشات نفس کے بالکل خلاف تھا۔ اس وجہ سے وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور جواب میں یہ کہتے تھے کہ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ قوموں کو تو صرف گردشِ روزگار فنا کرتی ہے۔

اہلِ عقل ہمیشہ خدا کے قائل رہے ہیں:

اثباتِ باری کے دلائل قرآن میں پیش نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل فکر وفلسفہ بھی ہمیشہ سے خدا کے وجود کے قائل رہے ہیں۔ اوپر اہل فلسفہ کی جو آراء بیان کی گئی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، رواقی فلسفی، کانٹ وغیرہ سب خدا کو وضاحت سے مانتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ متشککین خدا کے وجود کے منکر ہیں حالانکہ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ عقل ان معاملات میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہ تو اپنے عجز اور بے بسی کا اعتراف ہے۔ ان کے امام ڈیوڈ ہیوم نے کہا ہے کہ خدا کی ضرورت بہرحال موجود ہے۔ انسان اپنے معاشرتی اور اخلاقی نظام کو قائم رکھنے کے لیے خدا کو ماننے پر مجبور ہے۔ اس لیے میرے نزدیک متشککین کا نقطہ نظر بھی فی الحقیقت خدا کے وجود کے انکار کا ہم معنی نہیں ہے۔

خدا کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے:

تیسری وجہ یہ ہے کہ خدا تو ایک بدیہی حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات، یعنی تمام بدیہی باتوں سے زیادہ بدیہی ہے اس لیے یہ دلیل کا محتاج نہیں کیونکہ دلیل وہاں کام آتی ہے جہاں وہ دعوے سے زیادہ واضح ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص کسی بدیہی چیز کا انکار کرتا ہے تو اسے دلیل نہیں دی جاتی بلکہ اس کی حماقتوں پر اس کو توجہ دلائی جاتی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید ایک فطری چیز کو زیر بحث نہیں لایا۔ البتہ جگہ جگہ اس نے اس قسم کے سوالات کیے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق کون ہے، سورج کس نے نکالا اور چاند کو کس نے چمکایا ہے، آسمان کو کسی سہارے کے بغیر کس نے قائم کیا ہے۔ اکثر ان سوالوں کا جواب بھی خود ہی دے دیا ہے کہ اللہ نے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے پاس بھی اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ مثلاً سورہ مومنون میں آتا ہے:

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ؕ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؕ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ؕ

(مومنون - ۸۴ - ۸۹)

ان سے پوچھو یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں اگر تم جانتے ہو۔ کہیں گے اللہ کے۔ کہو تو کیا تم اس سے یاد دہانی نہیں حاصل کرتے۔ پوچھو کہ سات آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے۔ کہیں گے یہ سب اللہ کے ہیں، کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ تو پناہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابل میں کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی اگر تم جانتے ہو! وہ کہیں گے یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی ہیں۔ کہو پھر تمہاری مت کہاں ماری جاتی ہے۔

ذاتِ باری انسان کے فہم سے بالا ہے:

قرآن مجید نے ذات باری سے بھی کوئی بحث نہیں کی ہے یعنی خدا جن چیزوں سے بنا ہے ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نورِ مطلق ہے۔ نور کی بھی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں اور وہ کون سی قسم ہے اور اس پر مستزاد مطلق کا لفظ جس کے بعد ہم کسی طرح اس کا تعین نہیں کر سکتے۔ ایک فلسفی کا یہ قول مجھے بہت پسند ہے کہ "ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ خدا کیا نہیں مگر یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ خدا کیا ہے"۔ ذات کے مسئلہ پر قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنا کر بات ختم کر دی ہے جب وہ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے اور اس کی ذات کا مشاہدہ کرنے کی خواہش کی۔ فرمایا:

رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ

اے رب تو مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ خداوند نے کہا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا بلکہ پہاڑ کو دیکھ۔ اگر وہ اپنی جگہ ٹکا رہے تو تو مجھے دیکھ لے گا۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اہلِ تصوف ذاتِ الٰہی کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب حضرت موسیٰ ایسے جلیل القدر پیغمبر ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ نہیں کر سکے تو ان کی کیا حیثیت ہے۔ بشر کیا جبریلِ امین بھی جو خدا کے اتنے قریب

ہیں وہ بھی پردے کے اوٹ سے بات کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

اگر اپنی حد سے ذرا سا آگے بڑھ جاؤں تو تجلی کا فروغ مجھے وہیں جلا کر رکھ دے۔

خدا کی معرفت صفاتِ باری سے ہوتی ہے:

قرآن مجید کا اصل موضوع صفات باری ہے۔ کیونکہ ذات باری تو انسان کی دسترس اور فہم سے ماوراء ہے۔ اس کی صفات کے مظاہر انسان کی گرفت میں آتے ہیں اور وہ خدا کے بارے میں تصور ان کی مدد سے قائم کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے سب سے زیادہ وضاحت اور تاکید کے ساتھ توحید بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارا جھگڑا اسی کا ہے اور سارا بگاڑ اسی میں پیدا ہوتا ہے اور توحید پر مضبوطی سے قائم ہوئے بغیر خدا کی معرفت کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی، اس لیے قرآن مجید نے توحید پر پورے زور سے بحث کی ہے اور ہر رخنہ کو بند کر دیا ہے تاکہ شرک کا ہر شائبہ مٹ جائے اور شیطان کو اس کے اندر گھسنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ قرآن مجید نے توحید کے حق میں فطری یا نفسیاتی دلائل بھی دیے ہیں اور آفاقی بھی۔

توحید کا تصور انسان کی فطرت میں ہے:

توحید کے فطری دلائل میں ہمارا وجود ہماری فطرت اور اس کے تقاضے سب شامل ہیں۔ تمام بڑے بڑے فلسفی مثلاً سقراط، افلاطون، کانٹ، ڈیکارٹ سب اس بات پر متفق ہیں کہ سب کچھ انسان کی فطرت میں لکھا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک تمام علوم انسان کے اندر موجود ہیں۔ آپ اپنے وجدان، تذکیر اور غور و فکر کے ذریعہ ان کو نکالتے ہیں۔ جب سب چیزوں کا علم انسان کے اندر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کا علم کیوں نہیں ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ایک عہد فطرت کی یاد دہانی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ارواح کو تخلیق کرنے کے بعد ان سے پوچھا 'اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) سب نے یک زبان ہو کر کہا 'بَلٰى شَهِدْنَا' کیوں نہیں، تو ہمارا رب ہے، ہم اس پر گواہ ہیں۔ گویا توحید کی گواہی کا بنی آدم نے عہد کر رکھا ہے اور قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کا یہ عہد اس کے مشرکانہ افعال پر اس کے خلاف حجت ہوگا۔

بعض لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا بھی ہے یا نہیں، ہمیں تو اس کی کوئی خبر نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ عہد ہر انسان پر حجت ہوگا اس لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کے حق میں قوی دلائل ہونے چاہئیں۔ حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا یہ بات معلوم نہیں کہ ہر استحقاق (PRIVILEGE) کے ساتھ ذمہ داری (RESPONSIBILITY) بندھی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ماں بچے کو کتنے مصائب اور دکھ اٹھا کر پیٹ میں پالتی ہے۔ پھر جان کی بازی لگا کر اس کو جنم دیتی ہے۔ پھر ماں باپ مل کر ایک طویل عرصہ تک اس کی تربیت اور نگہداشت کرتے ہیں۔ والدین خود تکالیف اٹھا کر بچہ کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرتے ہیں، لیکن جب بچہ جوان ہو جائے والدین بوڑھے ہوں اور وہ اپنے والدین کا کوئی خیال نہ کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق یاد دلائے تو وہ جواب دے کہ مجھے نہیں معلوم کہ والدین کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا اقرار نہیں کیا تو کیا اس نوجوان کا یہ جواب قابل قبول ہوگا اور کیا ایسے بیٹے کو ہر شخص نافرمان اور لئیم نہیں کہے گا کہ وہ ایک ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلّم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری تو ہر استحقاق کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک انسان بیوی کے لیے نان و نفقہ اور حفاظت و حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر شہری کارپوریشن شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے اسی بنیاد پر مملکت اپنے عوام سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت و آزادی، جان و مال میں اس کو شریک کریں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کارپوریشن اور حکومت کی طرف سے فراہم کردہ تمام سہولتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتا اور یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہتا ہے کہ اس نے کسی ذمہ داری کا کوئی اقرار نہیں کیا تو کیا اس کا جواب درست ہوگا۔ کیا ٹیکس ادا نہ کرنے اور دوسری ذمہ داریاں ادا نہ کرنے پر حکومت اس کو سزا نہ دے گی؟

غور کیجیے کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار کا حق نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ہو سکتا ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان، قبیلہ، بادشاہ اور ریاست کے حقوق مانتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے ریاست کی شیرازہ بندی کے لیے انسان کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی ہم آہنگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔

فطرت انسانی شرک کو پسند نہیں کرتی:

قرآن مجید نے توحید کی دوسری نفسیاتی دلیل یہ دی ہے کہ کوئی غلام یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ بیک وقت متضاد خواہش رکھنے والے آقاؤں کی غلامی میں اپنے کو پیش کرے۔ وہ تو صرف ایک آقا کی غلامی کو پسند کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک وقت میں بہت سے آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ ایک خدا کو ماننا تو ایک مجبوری ہے، اس کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں، اس کے بغیر کائنات کی گتھی سلجھتی نہیں۔ ایک خدا کا قلادہ گردن میں ڈال کر مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر بہت سے خداؤں کا قلادہ گردن میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔

حقیقی ضرورت میں انسان صرف ایک خدا کو پکارتا ہے:

قرآن مجید نے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ انسان پر جب کوئی حقیقی مشکل یا افتقار کی صورت پیش آجاتی ہے تو وہ سب خداؤں کو بھول جاتا ہے اور صرف ایک خدا کو پکارتا ہے۔ جس انسان کے اندر کچھ بھی عقل اور شعور ہے تو وہ یہ جانتا ہے کہ اصل احتیاج اور حقیقی افتقار کے وقت میرے لیے سہارا صرف ایک ہی ہے جو میری فطرت میں ہے۔ اس کے دل کو اسی سے تسلی ہوتی ہے۔ گاندھی جی نے اپنے جنوبی افریقہ کے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے کہ میں جہاز میں سفر کر رہا تھا تو بڑا خطرناک طوفان آگیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ جہاز کے مسافروں میں پارسی، ہندو، مسلمان اور دوسرے مذاہب کے لوگ تھے لیکن اس وقت وہ سب کے سب صرف ایک ہی بھگوان کو یاد کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں یہاں
حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ	تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان
بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا	کو لے کر سازگار ہوا میں چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے
جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ	ہیں، تند ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف
الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا	سے گھیرے ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے
أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ	ہیں کہ اب ہلاک ہوئے۔ پکارتے ہیں اللہ کو اسی
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا	کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ اگر

مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۝

(یونس - ۲۲ - ۲۳)

تونے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ پس جب ان کو نجات دے دی دفعتہً وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں بلا کسی حق کے۔

انسان کے اندر افتقار اور احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے ماویٰ و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خودسری، رعونت اور استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پاکر اپنے ضعف، احتیاج کو بھول جاتا ہے، لیکن بس بھول جاتا ہے اس کی فطرت نہیں بدلتی چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریب اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے۔ وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

توحید کے حق میں کائنات کی شہادت:

قرآن مجید نے آفاقی دلائل بڑی کثرت سے بیان کیے ہیں جن میں سے دو دلائل مثال کے طور پر بیان کیے جارہے ہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کائنات میں تضادات کی کثرت ہے۔ دن ہے تو اس کے مقابل میں رات ہے، سردی کے مقابل میں گرمی ہے، خزاں ہے تو بہار ہے، آسمان و زمین، نور و ظلمت، حرارت و برودت، نشیب و فراز، مرد اور عورت ہر جگہ تضاد ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان تضادات کی کشمکش میں دنیا تباہ ہو جاتی لیکن ان کے اندر حیرت انگیز طور پر توافق اور سازگاری ہے۔ ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہے یا اس کے پیچھے کوئی مدبر، قاہر اور مقتدر ہستی ہے جو ان کے اندر توافق اور سازگاری پیدا کرتی ہے، جو آگ اور پانی کے تضادات کو نہایت خوبی سے دور کر کے ان کو انسان کی خدمت میں لگا دیتی ہے۔ قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان کے صالح نتائج کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے۔

وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں ایک شیریں اور پینے کے لیے خوشگوار ہے اور دوسرا کھاری

مِلْحٌ اُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۝

(فاطر ۱۲ - ۱۳)

اور کڑوا ہے اور تم دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور پہننے کے لیے زیور نکالتے ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو ان میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کر سکو اور تاکہ اس کی شکرگزاری کرو۔ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک ایک مقرر وقت تک کے لیے چلتا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔

قرآن مجید نے توحید کی دوسری آفاقی دلیل یہ دی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی اور نمایاں چیزیں جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے ان کی پیشانی پر خدائے قاہر و مقتدر نے اپنی غلامی کا ایسا داغ لگایا ہے کہ اس داغ سے وہ کبھی اپنے کو بچا نہیں سکتے۔ ان مظاہر میں سے جو جتنے شاندار ہیں ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط اور کسوف و خسوف کے آثار جو ہم ان میں دیکھتے ہیں دوسری کسی چیز میں نہیں دیکھتے۔ سورج ایک سیکنڈ سے پہلے کبھی طلوع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی غروب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح چاند کے لیے بھی ممکن نہیں کہ اس کے لیے طلوع و غروب کا جو وقت مقرر ہے اس سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی روگردانی کرے۔ حساب داں اپنے گھروں میں بیٹھ کر سورج اور چاند کے ریکارڈ کو دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے فلاں فلاں علاقہ میں سورج کا اتنا چہرہ تاریک ہوگا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کی بڑی بڑی چیزیں جب اس طرح محکوم اور غلامی کا نشان لیے ہوئے ہیں تو دوسری چیزوں کی کیا حقیقت ہے۔

توحید کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف حضرت ابراہیمؑ کی اس حجت کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ادبی حسن مجادلہ کی بہترین تصویر ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ

جب اس کو رات نے ڈھانک لیا اس نے ایک ستارے کو دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا، کہا میں غروب ہونے

الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي
رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ
فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا
رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ
يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ
إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي
فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ
حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝
(انعام ۷۶ - ۷۸)

والوں کو دوست نہیں رکھتا، جب چاند کو چمکتا
دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، جب ڈوب گیا، بولا
اگر میرے پروردگار نے میری رہبری نہ فرمائی تو لازماً
میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو
چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ بڑا ہے، جب
وہ بھی ڈوب گیا، کہا اے میری قوم کے لوگو! میں
ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم خدا کا شریک
ٹھہراتے ہو۔ میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس ذات
کی طرف پھیرا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

خدا ایک متشخص ذات ہے:

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا خدا متشخص ذات ہے یا ان قوانین اور قوتوں کا نام ہے جو اس کائنات میں جاری وساری ہیں قرآن مجید کے طرز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو مانتا ہے جو تمام اعلیٰ صفات رحم، قدرت، عنایت، مہربانی، شفقت، خبر، سمع، علم سب کی حامل ہے۔ مثلاً آیت الکرسی میں ہے:

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ
سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ
عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا
يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا
يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۝
(بقرہ: ۲۵۵)

اللہ نہیں کوئی معبود مگر وہ زندہ ہے اور قائم رکھنے
والا، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، اس
کے قبضہ میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین
میں ہے، کون ہے جو اس کے ہاں بغیر اس کی اجازت
کے سفارش کر سکے! وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے
آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے
علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے،
اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور ان کی
حفاظت اس پر گراں نہیں اور وہ بلند اور بزرگ ہے۔

یہ ایک ایسی ذات کی تعریف ہے جو تمام صفات حسنیٰ، تمام صفات قدرت وحکمت کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک ایسی ذات ہے جو حیّ وقیوم ہے، جس کو کبھی اونگھ تک نہیں آتی، وہ ایسی علیم ذات ہے جس کا علم لوگوں کے آگے پیچھے اور ان کے ماضی ومستقبل سب پر حاوی ہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمینوں کے تمام اطراف واکناف پر حاوی ہے۔ کوئی گوشہ اور کونہ بھی اس کے دائرہ اقتدار سے الگ نہیں ہے جس پر آسمان اور زمین کی دیکھ بھال ذرا بھی گراں نہیں گزرتی، اس کے لیے اس کو کسی سہارے یا مددگار کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ ذات بہت علی اور عظیم ہے۔ اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو ہم اپنے محدود پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔

پورے قرآن مجید میں خدا کی یہی شان بیان ہوئی ہے۔ سورہ حشر میں ہے۔

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝
هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ
الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ
الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ
اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ هُوَ اللَّهُ
الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ
يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝
(حشر: ۲۲ - ۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب
حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان ورحیم ہے۔ وہی اللہ
ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، یکسر
پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور،
صاحب کبریاء۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے
جن کو لوگ اس کا شریک بناتے ہیں۔ وہی اللہ
ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری
کرنے والا، اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں، اس
کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں
اور وہ غالب وحکیم ہے۔

ان آیات میں خدا کے بنیادی اوصاف بیان کیے گئے ہیں کہ وہی معبود ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ غائب اور حاضر دونوں کا جاننے والا ہے، رحمان اور رحیم ہے، اس نے یہ دنیا پیدا کی ہے، وہی بلا شرکت غیرے اس کا مالک اور حکمران ہے، ہر عیب، ہر نقص اور برائی وخرابی سے بالکل پاک ومنزہ ہے، وہ اپنے بندوں کے لیے ہر آفت اور ہر خطرہ سے امان اور سپر ہے، وہ امان دینے والا ہے، محافظ ونگران اور معتمد ووکیل ہے۔ وہ غالب اور قوی ہے، اس پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا، وہ سب کو شکست دے سکتا ہے۔ زور آور ہے۔ اپنی بڑائی اور برتری کا احساس رکھنے والا ہے۔ وہی ہر چیز کا خاکہ تیار کرتا ہے، وہی اس کو وجود بخشتا ہے پھر وہی اس کی صورت گری کرتا اور نوک پلک سنوارتا ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز اسی کی تسبیح کرتی ہے۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید خدا کی جو صفات بیان کرتا ہے وہ صرف ایک محرک، ایک علۃ العلل یا ایک قوت اور قانون فطرت پر منطبق نہیں ہوتیں۔ یہ آسمانی تشریف ان کے جسم ناتواں پر راس نہیں آتی۔ یہ صفات بہرحال خدا ہی کی صفات ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا ایک متشخص ذات ہے۔ خدا کیسا ہے یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ رات کے پچھلے پہر خدا اوپر کے آسمان سے نیچے کے آسمان پر کس طرح آتا ہے اور تلاش کرتا ہے۔ "ھَلْ مِن مستغفر اغفر لہ" (ہے کوئی مغفرت کا طالب کہ میں اس کی مغفرت کردوں؟) تو ہم کہیں گے کہ ہاں ہمیں معلوم ہے کہ وہ آتا ہے لیکن کیسے آتا ہے یہ کیفیت ہمیں نہیں معلوم۔ عرش پر وہ بیٹھتا ہے تو ہم کہیں گے "الاستوا معلوم والکیف مجھول" یہ معلوم ہے کہ وہ بیٹھا ہوا ہے عرش پر لیکن اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ہم اسے نہیں دیکھتے، وہ ہمیں دیکھتا ہے لیکن یہ کہہ نہیں سکتے کہ کس طریقہ سے وہ ہمیں دیکھتا ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ تین تاریکیوں کے اندر اس نے حضرت یونس علیہ السلام کی دعائیں سن لیں اور قبول کرلیں لیکن کس طریقے سے اس کو یہ خبر ہوئی یہ ہم نہیں جان سکتے۔ اسی لیے تو ہم نے اس کو خدا مانا ہے کہ ہماری ان تمام مشکلات کو حل کرے۔

خدا کا بندوں کے ساتھ تعلق:

اصل سوال یہ ہے کہ خدا ہے تو اس کے ہمارے اوپر حقوق کیا ہیں اور ہمارے فرائض کیا ہیں۔ یہی قرآن مجید کا اصل موضوع ہے۔ قرآن مجید نے سب سے زیادہ وضاحت سے خدا کے حقوق بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اس نے انسان پر کیا کیا فرائض عائد کیے ہیں، قرآن نے ان کے دلائل فطرت کے لحاظ سے بھی دیے ہیں اور آفاق کے لحاظ سے بھی بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ خدا کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات کے تقاضے بھی تسلیم کیے جائیں۔ خدا خبیر ہے، علیم ہے، سمیع ہے، پروردگار ہے تو ان صفات کے تقاضے قرآن مجید نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اسی سے دین بنتا ہے اور اسی سے شریعت بنتی ہے، خدا کا اصل ماننا وہی ہے کہ آپ خدا کے حقوق تسلیم کریں اور اس کے فرائض کو مانیں ورنہ آپ میں اور منکر میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

خدا کو ماننے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کو سب ہی مانتے ہیں حتیٰ کہ ڈیوڈ ہیوم ایسا مشکک بھی خدا کو ماننے کی ضرورت کا قائل ہے اور والٹیئر (VOLTAIER) کا یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ

باقی صفحہ ۵۲ پر

تزکیۂ نفس
امین احسن اصلاحی

ایمان اور اسلام

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی جامع تعبیر ایمان اور اسلام کے دو لفظوں سے کی گئی ہے۔ یہ دونوں لفظ اگرچہ عام استعمال میں ایک دوسرے کے قائم مقام کے طور پر بھی آئے ہیں۔ اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں لازم وملزوم ہیں۔ حقیقی ایمان کے لیے لازم ہے کہ اس کے ساتھ اسلام بھی پایا جائے، اسی طرح حقیقی اسلام کے لیے شرط ہے کہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ اگر ایمان موجود نہ ہو اور اسلام کا دعویٰ کیا جائے تو وہ منافقانہ اسلام ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی ایمان کا مدعی ہے، لیکن اسلام سے عاری ہے تو اس کا دعوائے ایمان محض ادعا ہے جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

ایمان اور اسلام لازم وملزوم ہیں:

اس اشتراک اور لزوم کے باوجود دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کا تعلق اصولاً ان بنیادی عقائد اور اساسی کلیات کے اعتقاد و اقرار سے ہے جن سے دین کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسلام کا اطلاق اصلاً ان عبادات، احکام اور قوانین کی اطاعت اور فرماں برداری پر ہوتا ہے جو ایمان کے مقتضیات کے طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ لیکن ان کے درمیان یہ فرق محض علمی دائرہ میں ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں یہ دونوں باہم مل کر وجود پذیر ہوتے ہیں اور اسی وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک یہ باہم مربوط رہیں اگر ان میں جدائی ہو جائے تو دونوں ہی معدوم ہو جاتے ہیں، نہ ایمان باقی رہتا نہ اسلام۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ:

اس زمانے میں لوگوں کے اندر یہ گمراہی بہت عام ہے کہ وہ نجات کے لیے صرف چند باتوں کو مان

لینا کافی سمجھتے ہیں، اعمال و اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے یا اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اس پر نجات کو منحصر سمجھیں۔ یہ گمراہی پہلے صرف بعض فرقوں میں محدود تھی، لیکن اس زمانہ میں یہ ہماری اکثریت کا دین بن گئی ہے، یہاں تک کہ اب اس کے خلاف کچھ کہنا بھی آسان نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ یہ بات جتنی ہی عام اور مقبول ہے اتنی ہی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ہے۔ قرآن میں 'اٰمَنُوْا' کے ساتھ 'وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' اس اہتمام و التزام کے ساتھ آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ہر مومن کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس سے اعمالِ صالحہ وجود پذیر ہوں۔ مثلاً فرمایا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ
وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ
عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا
وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ
يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ط

مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

(الانفال - ۸ : ۲-۴)

قرآن نے ایمان کو ایک ایسے مثمر درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں ثمرباری کر رہا ہو:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا
كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي
السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ
بِإِذْنِ رَبِّهَا ط

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی ہیں اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے

(ابراھیم - ۱۴ : ۲۴ - ۲۵)

آیات میں 'کلمۂ طیبہ' سے مراد ظاہر ہے کہ کلمۂ ایمان ہے۔ اس کی تمثیل اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ثمربار درخت سے دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور شاخیں فضا میں خوب پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں، اپنے رب کے فضل سے ثمرباری کر رہا ہو۔ زمین میں جڑوں کے گہرے اترنے سے مقصود فطرتِ انسانی کے اندر اس کا رسوخ و استحکام ہے کہ وہ گھورے پر اگے ہوئے پودے کے

مانند نہیں ہے، جس کی کوئی جڑ نہ ہو، حوادث کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی اس کو اکھاڑ پھینکے جیسا کہ کلمۂ کفر کی بابت فرمایا ہے کہ 'اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ' (ابراھیم - ۱۴ : ۲۶) (جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ پھینکا جائے، اسے ذرا بھی ثبات حاصل نہ ہو)۔ بلکہ وہ ایک تناور درخت کے مانند اتنی پائدار اور گہری جڑیں رکھتا ہے کہ اگر اس پر سے طوفان بھی گزر جائیں جب بھی وہ ذرا متاثر نہ ہو۔ پھر اس کی فیض بخشی اور ثمرباری کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہے، جس سے نہ کسی کو سایہ حاصل ہو نہ پھل۔ بلکہ اس کی فضا میں پھیلی ہوئی سایہ دار شاخوں کے سایہ میں قافلے آرام کرتے اور ہر موسم میں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان فیوض و برکات کی طرف ہے جو ایک صاحبِ ایمان کے ایمان سے خود اس کی زندگی اور اس کے توسط سے ان لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو اس سے کسی نوعیت سے قرب کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ فیوض و برکات لازماً علمی اور عملی، دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں اور ان سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رفعت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ
الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ط

اسی کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عمل صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔

(فاطر - ۳۵ : ۱۰)

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ کلمۂ ایمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف صعود کی فطری صلاحیت مضمر ہے، لیکن وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج ہے جو اس کو عملِ صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا اس کی مثال انگور کی بیل کی ہے، جس کے اندر فضا میں بلند ہونے، پھیلنے اور پھل پھول دینے کی صلاحیت تو ہوتی ہے، لیکن اس کی یہ صلاحیت بروئے کار اس وقت آتی ہے جب اس کو کسی ٹٹی اور چھپر کا سہارا حاصل ہو جائے۔ اگر یہ سہارا نہ حاصل ہو تو وہ اپنی جگہ ہی پر سکڑ کے رہ جاتی اور اس کی تمام صلاحیتیں مرجھا جاتی ہیں۔

اسی وجہ سے حقیقی ایمان کے ثبوت کے لیے ضروری ہوا کہ رسول کی کامل اطاعت یا بالفاظِ دیگر کامل اسلام کی عملاً شہادت دی جائے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ شہادت نہ فراہم کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی ذات کی قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جو اپنے اسلام کی شہادت نہ پیش کر سکے اس کے ایمان کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي

پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تم کو حکم نہ مانیں

اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○	اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

(النساء - ۴ : ۶۵)

اس آیت میں خطاب ان منافقین سے ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے، لیکن ان کے روابط مدینہ کے آس پاس کے ان یہودی قبائل سے بھی تھے جن کو ابھی مدینہ کی حکومت پوری طرح مستحکم نہ ہونے کے سبب سے اپنے اپنے حدود میں کچھ سیاسی قوت حاصل تھی، چنانچہ یہ منافقین اپنے مقدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لانے کے بجائے ان کی عدالتوں میں اس توقع سے لے جاتے کہ رشوت اور سفارش کے ذریعہ ان سے اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل کر سکیں۔ ان کی نسبت قسم کھا کر فرمایا کہ ان کا دعوائے ایمان محض لاف زنی ہے اگر ان کا عمل ان کے ایمان کے خلاف ہے۔ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ رسول کو اپنی زندگی کے معاملات میں حَکَم مانیں اور بے چون و چرا اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ اس اسلام کے بغیر ان کا ایمان معتبر نہیں۔

یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○	مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

(الحجرات - ۴۹ : ۱۵)

ایمان اور اسلام جامد نہیں ہیں:

ایمان اور اسلام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ جامد اور غیر نامی نہیں ہیں، بلکہ ان میں دم بدم اضافہ ہوتا رہتا ہے اگر ان کی پرورش و پرداخت کی جائے اور یہ مضمحل، بلکہ مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ دنیا کی دوسری نامی اور ذی حس چیزوں میں قدرت کا جو قانون جاری ہے وہی قانون ان میں بھی کارفرما ہے۔ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں برابر افزونی اور برکت ہوتی رہتی ہے جو اس کائنات میں تفکر کرتے اور اس کے اندر اس کے خالق کی شانوں، اس کی قدرتوں، اس کی حکمتوں اور اس کی رحمت و ربوبیت کے عجائب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ان قوانین و سنن پر نگاہ رکھتے ہیں جو اس دنیا میں جاری ہیں اور جو ایسے بے لاگ اور اٹل ہیں کہ نہ کبھی ان کے ظہور میں تخلف ہوتا اور نہ وہ کبھی جانب داری برتتے۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے رب کے تمام چھوٹے بڑے احکام پر عمل کرتے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ جو اس کے صبر و شکر کے امتحانوں سے گزر کر ہر امتحان کے بعد ایک نئی زندگی اور نیا عزم و حوصلہ حاصل کرتے ہیں اور خاص طور پر ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں یہ افزونی سب سے زیادہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں برابر تدبر کرتے ہیں اور ان کی زبانوں پر دل کی گہرائیوں سے یہ دعا جاری رہتی ہے کہ ' انی اسئلك بكل اسم هو لك، سميت به نفسك او انزلته فى كتابك او علمته احدا من خلقك ان تجعل القرآن ربيع قلبى و نور صدرى و جلاء حزنى و ذهاب همى و غمى[1] (اے رب! میں تیرے ہر اس نام سے جو تیرے لیے ہے، جس سے تو نے اپنے کو موسوم کیا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور، غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج بنا دے)۔

اِن کے بعد اُن لوگوں کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ان اوصاف سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان و اسلام کو تازہ و شاداب رکھنے کے لیے اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کریں گے، جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا، ان کا ایمان و اسلام دیکھ بھال سے محروم ہونے کے سبب سے جلد فنا ہو جائے گا۔ اس کی مثال اس پودے کی ہے جو اتفاق سے ان کے صحن میں اگ تو پڑا، لیکن نہ تو اس کو کبھی پانی اور کھاد کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی، نہ کبھی اس کی گوڑائی ہوئی اور نہ کبھی اس کو ناموافق ہواؤں اور اس کو تباہ کرنے والی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی۔

اس باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت، جو اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ ایمان بخشنے کو تو بہتوں کو بخش دیتا ہے، لیکن یہ پروان انہی کے اندر چڑھتا ہے جو اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ	اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم میری نعمت کے شکرگزار رہے تو میں

[1] مسند احمد بن حنبل : ج ۱

(ابراھیم - ۱۴ : ۷) اس میں بڑھوتری بخشوں گا۔

کسی نعمت کی صحیح شکرگزاری یہ ہے کہ اس کی دل سے قدر کی جائے اور اس کا حق صحیح صحیح ادا کیا جائے۔ اگر اس کا حق نہ ادا کیا جائے تو آدمی نہ صرف اس کے نفع سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ارشاد کے بموجب وہ اس کی اصل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر افزونی بخشتا ہے جو ان شدائد و مصائب کے مقابل میں اپنے ایمان و اسلام میں ثابت قدم رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق، اس کے ایمان و اسلام کی آزمائش ہی کے لیے ظہور میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ نہیں دیے جاتے، بلکہ وہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے امتحانوں میں ڈال کر پرکھے جاتے ہیں کہ ان کے دعوے میں کچھ صداقت ہے یا وہ محض زبان کے غازی ہیں۔ اس امتحان میں اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے دفتر سے ان کا نام مومنوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کا حوصلہ کرتے ہیں تو اس کی طرف سے اس جدوجہد کے لیے بھی قوتِ ایمانی کا بدرقہ عنایت ہوتا ہے اور امتحان میں کامیابی کے بعد امتحان کے درجہ اور کامیابی کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے ایمان میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○

(العنکبوت - ۲۹ : ۲)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ لینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟

اس امتحان میں ثابت قدمی دکھانے والوں کی اللہ تعالیٰ جس طرح مدد کرتا ہے اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۖ ق

(الکہف - ۱۸ : ۱۳)

یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی۔

یہ آیت اصحابِ کہف کے ذکر کے سلسلہ میں اس مقام پر آئی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وہ اپنی دعوتِ توحید سے باز نہ آئے تو لازماً سنگسار کر دیے جائیں گے۔ قوم کے اس فیصلہ سے مرعوب ہو کر اپنا دین چھوڑنے کے بجائے انھوں نے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا عزم بالجزم کیا اور اپنے

رب سے دعا کی کہ اے رب! اب آگے کے مراحل میں راہ کھولنے والا تو ہے۔ ان کی اس عزیمت اور اس دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ ایمانی میں اتنا اضافہ کر دیا کہ وہ تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے پوری طرح اہل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی وہ شانیں ان کے لیے ظاہر ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہی جوشِ ایمان سچے مسلمانوں کے اندر اس وقت ابلتا جب منافقین ان کو یہ ڈراوے سناتے کہ دشمنوں کی تمام قوتیں تمہیں فنا کر دینے کے لیے مجتمع ہو رہی ہیں تو یہ چیز ان کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کی بجائے ان کے ایمان کو اور زیادہ بڑھانے والی بنتی۔ فرمایا ہے:

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ ق

(آل عمران - ۳ : ۱۷۳)

(منافقین اہلِ ایمان کو ڈراتے ہیں) کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا۔

اہلِ ایمان کی یہ خصوصیت قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جب اعداء ان کے ایمان کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے قوت خود ان کے ایمان ہی کے سرچشمہ سے ابلتی ہے۔ رکاوٹوں کے مقابل میں اہلِ ایمان کا عام حال یہ بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○

(التوبة - ۹ : ۱۲۴)

سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔

یعنی منافقین جن باتوں سے ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے ہیں وہی باتیں اہلِ ایمان کے ایمان اور ان کے عزم و حوصلہ کو بڑھاتی ہیں۔ ؎

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

اہلِ ایمان کے اس کردار کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کر رہی ہے:

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ○

(الاحزاب - ۳۳ : ۲۲)

(اہلِ ایمان کہتے ہیں کہ) اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا (وہی باتیں پیش آ رہی ہیں جو پہلے سے بتا دی گئی تھیں)۔ اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت ہی میں اضافہ کیا۔

ایک ضروری تنبیہ :

یہاں ایک تنبیہ بہت ضروری ہے وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے یا بڑھنے کے قائل نہیں تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ ہمارے اس دعوے کے خلاف پڑتی ہے جو ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کا کوئی خاص محل ہوگا جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے ورنہ ایک جلیل القدر امام ایک ایسی بات کس طرح فرما سکتے ہیں جو بظاہر قرآن اور حدیث، دونوں کے خلاف نظر آتی ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا صحیح محل یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی اور فقہی ایمان مانیے۔ قانون صرف ظاہر سے بحث کرتا ہے، کسی شے کی حقیقت اور اس کے کیف وکم سے بحث کرنا اس کے مقصد سے خارج بھی ہے اور اس کے دائرۂ امکان سے باہر بھی۔ اس کے نزدیک ہر وہ شخص جو چند معلوم باتوں کا اقرار اور چند معروف رسوم کو ادا کرتا ہے، مومن اور مسلم ہے۔ اس امر سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ وہ جن باتوں کا اقرار کرتا ہے ان کو دل سے مانتا اور ان کا یقین بھی رکھتا ہے یا محض زبان سے ان کا اقرار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جن رسوم پر عمل کرتا ہے، محض ظاہر دارانہ کرتا ہے یا اس کے اندر کچھ صدق و اخلاص بھی ہوتا ہے۔ یہ سوالات اس مقصد سے غیر متعلق بھی ہیں اور ان کی تحقیق کا اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اس کا اصل کام اسلامی سٹیٹ کے شہریوں کے لیے ایک معیار معین کرنا ہے جس کو سامنے رکھ کر وہ ان کی نزاعات اور ان کے حقوق کا فیصلہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار سب کے لیے یکساں ہوگا اور اس کی تعیین میں صرف وہی چیزیں کام دے سکتی ہیں جو بالکل ظاہر ہوں۔ وہ چیزیں اس میں کام دینے والی نہیں بن سکتیں جن کا تعلق باطنی کیفیات اور حقائق سے ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا ایک عمدہ محل مل جائے گا۔ ان کی بات نہ قرآن وحدیث کے خلاف محسوس ہوگی نہ ہمارا مسلک ان کے مسلک سے متصادم ہوگا۔ اس طرح کی بعض اور باتیں بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں جو بظاہر قرآن وحدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہیں حالانکہ وہ اپنے اصل مقام میں بالکل صحیح ہیں، لیکن لوگوں نے ان کے موقع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کے کامل نمونہ :

اسلام کے کامل نمونہ کی حیثیت سے قرآن نے سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کا ذکر کیا ہے،

جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ لازماً وہ ایمان کے بھی نمونۂ کامل ہیں۔ ہم مضمون کی تمہید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان میں افتراق صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب یہ صرف ظاہراً پائے جاتے ہوں۔ حقیقتہً پائے جانے کی صورت میں ان میں افتراق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کامل نمونۂ اسلام کی حیثیت سے پیش کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ خاص اسلام کے امتحان میں انہوں نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ تنہا انہی کا حصہ ہے۔ اس آسمان کے نیچے کسی کو اللہ تعالیٰ نے اس امتحان میں نہیں ڈالا، صرف انہی کو ڈالا اور خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی ہے کہ آپ نے سو فی صد کامیابی حاصل کی۔

اسلام کی تعبیر عام طور پر 'گردن نہادن بطاعت' سے کی جاتی ہے۔ یہ تعبیر بالکل مطابق حقیقت ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حکم پر قربان کر دینے کے لیے اپنے کو تیار کر لیا وہ مُسلِم ہے۔ ایک مسلم کا شعاری کلمہ: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام - ۶ : ۱۶۲) (میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ، رب العٰلمین کے لیے ہے) ہے۔ سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام نے اپنی عملی زندگی سے اس کی شہادت دی اس وجہ سے وہ اسلام کے کامل مظہر قرار پائے۔ وہی ہیں جنہوں نے اپنے لیے مسلم بنائے جانے کے ساتھ ساتھ اپنی ذرّیت میں بھی ایک امت مسلمہ برپا کرنے کی دعا کی :

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ص

اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذرّیت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کی قبولیت کے نتیجہ میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ذرّیت میں خاتم الانبیاء، محمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جو ایک عظیم امت مسلمہ کے داعی اور مؤسس ہوئے اور سیدنا ابراہیمؑ نے جس امت کا نام 'امت مسلمہ' اپنی دعا میں تجویز کیا تھا جب آپ کی بعثت ہوئی تو اس کا نام امتِ مسلمہ رکھا گیا۔ اس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے :

ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۵ۙ مِنْ

اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے۔

قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا   اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے۔

(الحج - ۲۲ : ۷۸)

یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین، اسلام ہی ہے : اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " (آل عمران - ۳ : ۱۹) (اللہ کا اصل دین اسلام ہے)۔ سیدنا ابراہیم علیہم السلام اسی دین پر تھے۔ دوسرے نام اسلام کے سوا جو اختراع کیے گئے وہ بدعت کی راہ سے اختراع کیے گئے۔ یہ امت ——— امتِ مسلمہ ——— دنیا میں اس لیے برپا کی گئی کہ اسلام کے نام اور اس کی روح، دونوں کی حامل بنے۔ اللّھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

بقیہ : خدا کی ذات وصفات از صہ۴۳

کائنات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ خدا ہے (NATURE CRIES THAT GOD EXISTS) لیکن یہ ماننا آپ پر حجت تمام کرتا ہے جس سے لازم آتا ہے کہ آپ اس کے حقوق بھی مانیے۔ خدا نے دنیا میں انسان کو ایک محدود زندگی، محدود دائرے میں محدود اختیار دے کر امتحان کے لیے مہلت دی ہے۔ آپ اس امتحان کو پاس کریں یعنی خدا کے حقوق ادا کریں تو آپ ابدی اور ازلی انعام کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور اگر فیل ہو جائیں گے تو پھر ابدی جہنم میں جائیں گے۔

(ترتیب : محبوب سبحانی)

مراسلہ ومذاکرہ

امین احسن اصلاحی

قادیانیوں کی تکفیر کی بنیاد

سوال : قادیانیوں کی لاہوری جماعت نے جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ میں ایک مقدمہ برائے استقرارِ حق بدیں مضمون دائر کر رکھا ہے کہ عدالت انہیں مسلمان قرار دے۔ اس سلسلہ میں یہ دریافت کرنا ہے کہ مرزا غلام احمد اور اس کے متبعین کا خارج از اسلام ہونا اجماعِ اُمّت کے کن شواہد سے ثابت ہے۔

جواب : قادیانیوں کی تکفیر اصل ماخذِ دین ——— کتاب اللہ اور سنت رسول ——— کے نصوص پر مبنی ہے۔ سورۃ احزاب کی آیت ۴۰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب خاص کی وضاحت "وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" (بلکہ وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں) کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ خاتَم اور خاتِم دونوں لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔ قوم کا آخری فرد، کسی شے کا انجام، خط کے آخر کی مہر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اس لیے خاتم النبیین کے معنی ہوں گے سلسلۂ انبیاءؑ کا آخری فرد۔ ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے جب کہ ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔ اس وجہ سے حضورؐ خاتم النبیین ہیں تو خاتم الرسل بھی بدرجہ اولیٰ ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاءؑ کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے۔ اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو یہ بشارت حضور کے نامِ نامی کی تصریح کے ساتھ دی جس کا حوالہ قرآن مجید میں سورۃ الصف : ۶ میں ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر یہ روایت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اپنے بعد کسی آنے والے کی بشارت نہیں دی، بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار و اعلان فرمایا کہ آپؐ آخری

نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ یہ روایات موطا، بخاری، مسلم، ترمذی سب میں مذکور ہیں۔ مثلاً بخاری کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی تمثیل یوں ہے کہ ایک شخص نے ایک عمارت بنائی، نہایت حسین و جمیل، لیکن اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی تحسین کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی سو میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں کم و بیش انہی الفاظ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا بالآخر وہی کونے کا آخری پتھر بنا۔

یہ ختم نبوت اس تکمیل دین کا لازمی بدیہی تقاضا ہے جس کا ذکر اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ والی آیت میں ہوا ہے۔ اگر دین کوئی ایسی چیز ہوتا جس کی تکمیل کبھی ہونے والی ہی نہ ہوتی تب تو بیشک نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن جب دین کی تکمیل ہو چکی تو اس کا یہ لازمی نتیجہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے اللہ نے جو انتظام فرمایا ہے وہ بھی درحقیقت ختم نبوت ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کتاب و سنت کے ان قطعی نصوص کی بناء پر پوری اُمتِ مسلمہ کا روزِ اوّل سے یہ عقیدہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے ختم نبوت پر ایمان لانا واجب ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والا نہیں بن سکتا۔

جو باتیں کتاب و سنت کے نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہوں ان کے بارے میں اجماع یا غیر اجماع کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اجتہاد کسی منفرد مجتہد کا بھی ہو سکتا ہے اور وقت کے تمام مجتہدین کا بھی۔ جس اجتہاد پر وقت کے تمام مجتہدین مجتمع ہوں وہ اصل اجماع ہے خلفائے راشدین کے دور میں جو اجماع ہوئے ہیں ان کا درجہ یہی ہے۔ بعد کے ادوار میں جب اسلامی حکومت منتشر ہو گئی کسی امر اجتہادی میں اجماع کا معلوم کرنا آسان نہیں رہا۔ تاہم خاتم النبیین کے مفہوم یا ختم نبوت کے عقیدہ کے بارے میں خلفائے راشدین کے دور سے لے کر آج تک پوری امت مسلمہ میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ بعض گمراہ اشخاص نے اگر نبوت کا دعویٰ کیا تو اسلامی حکومت نے انہیں قتل کرا دیا کہ انہوں نے ختم نبوت کے مسلّم عقیدہ کے خلاف بغاوت کی ہے۔ اس دورِ آخر میں مرزا غلام احمد نے یہ دعویٰ کیا تو وہ بھی

مستحق تو دراصل اسی سزا کے تھے لیکن وہ کافروں کی حکومت کے زیر سایہ بچے رہے۔ اب پاکستان کی حکومت نے اگر ان کے پیرووں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے تو یہ ان کے ساتھ ایک رعایت ہے۔

(ترتیب : خالد مسعود)

اہلِ ایمان کا ابتلاء کیوں؟

سوال : دنیا کی زندگی امتحان سے عبارت ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ اہل ایمان اور خصوصاً انبیاء و صلحاء کو بڑی بڑی آزمائشیں کیوں پیش آتی ہیں؟

جواب : ایمان کی راہ اختیار کرنے کے بعد یہ توقع بالکل عبث ہے کہ خدا کے فرشتے جھوک کرتے ہوئے ہمارے آگے آگے چلنے لگیں گے اور خدا ہمارا ممنون ہوگا کہ ہم نے اس کے رستے پر چلنے کا عزم کر لیا ہے۔ قرآن مجید نے واضح طور پر بتایا ہے کہ اہل ایمان یہ تصور دل سے نکال دیں کہ وہ دعوائے ایمان کی بدولت چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔

دنیا میں حق و باطل کی جو کشمکش چل رہی ہے اس میں آپ دیکھیں گے کہ کبھی کفر کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی اہل ایمان کو۔ کفر کو جو غلبہ حاصل ہوتا ہے یا کفار کو مومنین پر فتح حاصل ہوتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کفر کے ساتھ کوئی ہمدردی ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ان کو یہ ایک ڈھیل ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں، جو کمائی انہیں کرنی ہے وہ پوری کر لیں، ان پر حجت تمام ہو جائے کہ جتنا موقع ان کو دیا جانا چاہیے تھا وہ خدا نے ان کو دے دیا۔ قیامت کے روز ان کے پاس عذر کے لیے کچھ پیش کرنے کے لیے نہ ہو۔

جہاں تک مومنین کا تعلق ہے، ان کو اگر کوئی افتاد پیش آتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سبب یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خداوند تعالیٰ کو اپنے نیک بندوں سے کوئی عناد نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنا مقتدر مالک اور کائنات کا بادشاہ ہے کہ اپنی کمزور اور حقیر مخلوق کے ساتھ اس کی عداوت کا تصور کرنا بھی اس کی شان کے منافی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے اس بارے میں یہ بتایا ہے کہ اگر اہلِ ایمان کو کوئی افتاد پیش آتی ہے تو اللہ کے اذن سے پیش آتی ہے۔ اور وہ مومنین کے اعمال ہی پر مترتب ہوتی ہے یعنی اس کے اسباب باہر نہیں بلکہ ان کے اپنے اندر ہی ہوتے ہیں۔

ایک مومن کو جب کوئی ابتلا پیش آئے تو سب سے پہلے اسے یہ سوچنا چاہیے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہو۔ انسان کی ایک عجیب غلطی یہ ہے کہ وہ جب کوئی ٹھوکر کھاتا یا اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے

توالزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ بے وقوف آدمی تو ہمیشہ اپنی غلطیوں کا محرک یا ٹھوکر کھلانے والا کسی دوسرے کو تلاش کرتا ہے اور وہ بھی عموماً کسی بے گناہ کو، لیکن ایک عاقل اور حکیم آدمی فوراً اپنے اندر کا جائزہ لیتا اور اپنی کوتاہی کو متعین کر کے اپنی اصلاح کی فکر کرتا ہے۔

ایک مومن اگر اپنی کسی کوتاہی سے آگاہ نہ بھی ہو سکے تو اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تربیت اور خامیوں کی اصلاح کے لیے اس کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بندے کی عزت اس کے اعمال و کردار کی بدولت ہے۔ اگر اس میں کوئی خامی پیدا ہو جائے تو اس کا تربیت کا قانون لازماً حرکت میں آئے گا اور اس کے تقاضوں کے مطابق بندے کو امتحان پیش آئے گا جس کا مقصد اس کی اصلاح و بہبود یا دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک میں یا ان دونوں میں اس کو سرفراز و سرخرو کرنا ہوگا۔

اسی تربیت ہی کی ایک شکل وہ آزمائشیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو پیش آئی ہیں۔ حضرت ایوبؑ اور حضرت یعقوبؑ کے مصائب کی داستان پڑھیے۔ ایسے عالی مقام لوگوں کے ذہنوں میں کبھی کسی برائی کا تصور بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان کی آزمائشوں کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو امتحانوں میں اس لیے ڈالا کہ وہ بڑے سے بڑا امتحان پاس کر کے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کریں اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو بلند سے بلند تر کرتا جائے۔ انسان کی فطرت آزمائش میں کامیاب ہو کر تربیت پاتی اور مزید ترقی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ترقی کے مواقع اپنے بندوں کو فراہم کرتا رہتا ہے تاکہ ان کے درجات بلند ہوں۔

پس ایک بندہ مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کوئی مصیبت آنے پر داویلا کرے، سینہ کوبی کرے اور اللہ میاں سے شکوے کرے۔ اس کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اس مصیبت کو اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ یا کسی خامی یا کمزوری پر تنبیہ قرار دے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ اگر وہ صبر و ضبط کے ساتھ اس نازک وقت کو گزار جائے گا تو آہستہ آہستہ اس پر واضح ہو جائے گا کہ جو کچھ پیش آیا اسی میں حکمت تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوا، اسی میں خیر و برکت تھی۔ یہ یاد رکھیے کہ ایمان کے راستے میں جو سخت امتحان پیش آتے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ اس سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ کوئی دھچکا ایسا سخت ہوتا ہے کہ آدمی کے فلسفے کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے اور اس کی اینٹیں بکھر جاتی ہے لیکن ضرورت ہوتی ہے کہ ان اینٹوں کو پھر سے جوڑ جاڑ کر ان کی جگہ جما دیا جائے۔ میں نے اس خطرے سے اس لیے آگاہ کیا ہے کہ فلسفے کا جتنا مطالعہ میں نے کیا ہے اس سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بڑے بڑے فلسفیوں کے لیے یہی چیز مزلۂ قدم بنی ہے اور وہ اس کو کسی طریقے سے حل نہیں کر پائے۔ نتیجۃً وہ مثبت اور منفی دونوں قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے۔

(ترتیب : خالد مسعود)

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی :	۶۰ — ۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵ — ۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵ — ۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۷۲۰ — ۰۰
" : فی جلد :	۸۰ — ۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن :	۱۶ — ۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲ — ۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰ — ۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶ — ۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳ — ۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸ — ۰۰
۸۔ توضیحات :	۱۲ — ۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اوّل	۲۷ — ۰۰
: جلد دوم	(زیرِ طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبرِ حدیث :	(")
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(")
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(")
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(")
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(")
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(")

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور۔۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹